المرشد

جلد ۴ ٭ شمارہ ۱۰ ٭ اگست ۱۹۸۳ء مطابق شوال ۱۴۰۳ھ

ماہنامہ

دینی
اصلاحی
علم
سلوک
اور
تصوف کا
واحد
مجلہ

المرشد

چکوال (جہلم)
پاکستان

سرپرست اعلیٰ
حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب
دامت برکاتہم العالیہ

مدیر مسئول
پروفیسر
حافظ عبدالرزاق
ایم اے عربی اسلامیات

مجلس ادارت
پروفیسر بنیاد حسین نقوی
(بی اے آنرز) ایم۔ اے
مولانا محمد اکرم ملک مناروی
پروفیسر باغ حسین کمال
ایم۔ اے
حافظ عبدالقیوم بی اے

سول ایجنٹ
مدنی کتب خانہ
گنپت روڈ
لاہور

رابطہ کے لئے
دارالعرفان منارہ (جہلم)

اس شمارے میں

اداریہ — مدیر
باتیں ان کی خوشبو خوشبو — حضرت العلام مدظلہٗ
اسرار التنزیل — مولانا محمد اکرم ملک
دیکھتا چلا گیا — سیلانی کے قلم سے
چراغِ مصطفوی — پروفیسر عبدالرزاق ایم اے
تصوف وسلوک ۔ مولانا عبدالباری ندوی
شیطان کے مکروفریب — فیض الرحمان اسلام آبادی
المرشد : یوسف نوشہروی
ریاکاری — حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی

زرسالانہ ۳۵/-
ششماہی ۱۸/-
فی پرچہ ۳/-
بیرون ملک ۱۰۰/-

حافظ عبدالرزاق پبلشر نے منہاج الدین اصلاحی پرنٹر شرکت پریس نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر ماہنامہ المرشد الحسنات منزل چکوال جہلم سے شائع کیا

ماہنامہ المرشد: اگست ۱۹۸۳

اداریہ

مابعد رمضان

ماہِ رمضان، اس گئے گزرے دور میں بھی اپنی روحانی جلوہ سامانیوں سے ملتِ اسلامیہ پر بہت سارے ظاہری و باطنی اثرات مرتب کر جاتا ہے۔ ہر شخص پر اس کے اثرات اس کی استعداد اور محنت کے سبب جُداگانہ ہوتے ہیں مگر عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ رمضان کی بھٹی سے گزرے ہوئے لوگ کم از کم ظاہری طور پر:-

ا۔ معاملات میں حتی الوسع کھرے ہو جاتے ہیں۔

ب۔ نماز کے عادی سے ہو جاتے ہیں۔

ت۔ وقتی طور پر بھوکا رہنے سے لطف اُٹھانے لگتے ہیں۔

ث۔ پابندیٔ وقت کی کچھ نہ کچھ عادت پڑ جاتی ہے۔

ج۔ خداوند تعالےٰ کی ذات سے بلاواسطہ تعلق کا مزہ لینے لگتے ہیں۔

کچھ لوگوں پر یہ اثرات عارضی ہوتے ہیں۔ کچھ پر بہت ہی عارضی اور صرف عید کے دو دن کی حشر سامانیوں کو بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ کچھ ذرا مزید تکلّف سے کام لیتے ہیں اور ان اثرات کو کچھ عرصہ تک اپنے اوپر طاری رکھتے ہیں۔ اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو ان اثرات کو دوسرے رمضان المبارک تک سنبھالے رکھتے ہیں۔ چونکہ ان اثرات کا شعور رکھنا ان کے دیر تک سنبھالے رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اس عبادت کے شروع ہونے سے پہلے اس کے متعلق نہ صرف تمام فقہی مسائل سے خود کو مکمل طور پر آگاہ کرے بلکہ اس عبادت کی غرض و غایت پر بھی نگاہ رکھے۔ اور جو مسلمان روزے اس طریقے پر رکھتے ہیں

وہی ایسے لوگ ہیں جو اس عبادت کے اثرات کو اپنے اندر جذب کرنے کی استعداد بھی رکھتے ہیں اور اس کے اثرات سے دیر تک مستفید بھی ہوتے رہتے ہیں۔

روزہ فی الواقع ایک عظیم عبادت ہے۔ یہ نہ صرف اُمتِ محمدیہ پر فرض ہے بلکہ پہلی اُمتوں پر بھی فرض کی گئی۔ اس عبادت کے اثرات پر ہر دور میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ اور کوئی بھی اچھی سی کتاب نکال کر اس موضوع کی تشنگی دُور کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے پیشِ نظر جو اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح اس عبادت کے اثرات کو تادیر قائم رکھا جائے اور ایک مہینہ کی مسلسل تربیت نے جو کچھ ہمیں سکھایا اس کو نہ صرف اپنی ذات پر لاگو رکھا جائے بلکہ اپنے قریبی لوگوں پر بھی اس سے روشناس کیا جائے۔

مفسرین نے سورۂ عصر کے بارے میں لکھا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے جواب میں اگر باری تعالےٰ صرف سورۂ عصر نازل فرما دیتے تو جواب کافی ہو جاتا۔ مگر یہ باری تعالےٰ کی بیکراں عنایت ہے کہ صرف اس سورۃ پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اس سورۃ میں کیا ہے جس نے اسے سورۂ فاتحہ کا جواب کہلائے جانے کا مستحق قرار دیا ہے؟

وجہ چار اعمال ہیں (ا) آمنو (ایمان تمام ضروریات کے ساتھ) (ب) عملوا الصلحٰت (اعمالِ صالحہ)
(ت) تواصوا بالحق (ایک دوسرے کو حق کی تلقین) (ث) تواصوا بالصبر (ایک دوسرے کو صبر کی تلقین)

اب غور کیجیے کہ کیا یہی چاروں اعمال روزے کی عبادت کے بلا واسطہ اثرات نہیں۔ یقیناً روزہ ہمارے انہی اعمال میں پختگی پیدا کر کے ان کو ہماری شخصیت کا ایک جزو بنانے میں تمام عبادات سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتا ہے ـــــ تمام عبادات کے ظاہری پہلو ظاہری اثرات بھی رکھتے ہیں مگر باشعور لوگوں کے لئے ان کے باطن پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل باطن کی اصلاح آج کے دور کی اہم ترین ضرورت ہے روزے کے جو اثرات باطن پر مرتب ہوتے ہیں وہ باقی تمام عبادات کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ روزے کے دوران نمازوں میں بھی مزہ آنے لگتا ہے روزے میں اعمال صالحہ کا بھی بڑا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، روزہ دار، روزہ خوروں کے لئے تواصوا بالحق اور روزہ داروں کے لئے تواصوا بالصبر کا عملی نمونہ بن جاتے ہیں۔ مگر کیا یہ اثرات صرف ماہِ رمضان تک ہی محدود رہنے چاہئیں ہرگز نہیں خداوند قدوس نے کہیں بھی ایسا حکم نہیں دیا۔ حضور اکرم صلعم نے کہیں بھی روزے کے اثرات کو محدود کرنے کی تلقین نہیں کی تو پھر ہم نے کیوں ان اثرات کو محدود کر رکھا ہے

آیئے عہد کریں کہ رمضان کے جو اثرات ہماری شخصیتوں پر مرتب ہوئے ہیں انہیں اگر تمام عمر کے لئے نہیں تو کم از کم اگلے رمضان تک ضرور قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ خدا ہمیں اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین (مدیر)

باتیں
اُن کی
خُوشبو خُوشبو

ارشادات شیخ مکرّم حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ العالی

خطبہ جمعۃ المبارک سے اقتباس

شریعت ــــ طریقت ــــ حقیقت ــــ معرفت

(ا) **شریعت** نام ہے کُل اور مجموعہ احکام کا۔ سارے کے سارے احکام (مجموعہ احکام) جو ہیں اُن سب کو شریعت کہا جاتا ہے، خواہ ان احکام کا تعلق اُمورِ باطنہ سے ہو یا اُمورِ ظاہرہ کے ساتھ۔
علماء متقدمین اور تمام صوفیاء اس بات پر متفق ہیں کہ "شریعت" لفظ "فقہ" کے مترادف ہے چونکہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف ہی یہ کی ہے: معرفۃ النفس مالھا وما علیھا (نفس کی پہچان! جو اُس کے نفع کی چیز ہے یا نقصان کی چیز ہے) اس لئے مجموعہ احکام ظاہری اور باطنیہ اعمال بھی سارے کے سارے اس میں آ گئے۔ متاخرین علماء نے اس کی تقسیم یوں کی ہے احکام ظاہری پر انھوں نے فقہ کا اطلاق کر دیا اور جن اُمور کا تعلق باطن سے ہے اُن پر تصوّف کا اطلاق کر دیا ــ اسلام سے باہر تو کوئی چیز نہیں، یہی شریعت ہے یہی حقیقت ہے، یہی سب کچھ ہے اسی کو شریعت کہتے ہیں۔
(ب) **طریقت**: اُن وسائل، ذرائع اور طرق کا نام ہے جن کے ذریعہ سے احکام ظاہری یا احکام باطنی حاصل کئے جائیں۔ مثلاً درس تدریس، پڑھنا پڑھانا، تصنیف کرنا، لکھنا، تبلیغ کرنا، کسی سے

پوچھ لینا — یہ رستے اور ذرائع ہیں شرعی احکام تک پہنچنے کے، انھیں طریقت کہا جاتا ہے (طریقت کہتے ہی رستے کو ہیں یعنی اس راہ پر چل کر کسی چیز کو حاصل کرنا۔ انسان ہمیشہ کسی مقصد کے لیے حرکت کرتا ہے) اسی طرح باطنی اُمور یعنی تصوف میں لطائف کرنا، مراقبات کرنا وغیرہ۔ اصل تصوف ہے رضائے الٰہی کا نام، اللہ کی رضا حاصل کی جائے اللہ کی محبت حاصل کی جائے، اُس کی رضا کس امر میں ہے، اور وہ ناراض کس بات میں ہے (اسے حاصل کیا جائے) تصوف اس چیز کو کہتے ہیں یہ نہیں کہ کوئی چیزیں دیکھ لیں، کشف ہوگیا، الہام ہوگیا۔ تو یہ سمجھنے لگے کہ میں صوفی بن گیا، بڑی چیز بن گیا، نہیں بلکہ تصوف کی حقیقت یہ ہے رضائے الٰہی حاصل کی جائے، یہ دیکھنا کہ اللہ کی محبت کس طرح حاصل ہو اللہ کی رضا کس چیز میں ہے — اللہ کی رضا اس کی عبادت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں ہے قال تعالٰے: قُلْ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اگر آپ اللہ کے محبوب بننا چاہتے ہو اور اللہ کو محبوب بنانا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ یہ ہے طریقت ہے۔

اب ذرا غور کریں کہ حقیقت کس کو کہتے ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ کسی چیز کی صورت حاصل ہو جائے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کی حقیقت واضح ہو جائے۔ مثال کے طور پر صوفیائے کرام یہ کہتے ہیں کہ نماز کی صورت جو ہے وہ عام مسلمانوں کو حاصل ہے حقیقت تک رسائی کم ہے ایمان کی صورت حاصل ہے، حقیقت حاصل نہیں ہے جس سے آدمی مسلمان بن جاتا ہے مومن بن جاتا ہے دین دار بن جاتا ہے اب ذرا صورت اور حقیقت کا مفہوم سمجھ لیں۔ "علم کہتے ہیں"

حصول صورة الشئ فی الذہن (یعنی صورت چیز کی ذہن میں آجائے، یا قبول النفس تلک الصورة (یا نفس اس صورت کو قبول کرلے) اسے علم کہتے ہیں کہ صورت کا حاصل ہو جانا۔ ایمان کی صورت آگئی، روزے کی صورت آگئی، کلمے کی صورت آگئی۔ حقیقت کیا ہے؟ — مثال کے طور پر کوئی شخص کہتا ہے کہ ڈی، سی فلاں مقام پر آگیا ہے ہم نے اس کی بات تسلیم کرلی، یہ ایمان تقلیدی ہے کہ اس کی بات سن کر قبول کرلی۔ عوام کا ایمان جو ہے تقلیدی ہے، تقلیدی ایمان تشکیک مشکک کے ساتھ زائل ہو جاتا ہے، کس نے شک و وہم میں ڈالا تو اس کو چھوڑ بیٹھا — عوام کی گمراہی کا سبب کیا ہے، جیسی صحبت ملی ویسے ہوگئے، کسی بدعتی گمراہ سے ملے اُسی

سے متاثر ہو گئے۔ بات در اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوئی۔ اس لئے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اطمینانِ قلب پورا نہیں ہوتا۔ خبر دینے والے نے خبر دی دوسرے نے کہا غلط کہتا ہے جھوٹ بول رہا ہے، شک پیدا ہوا، یقین رخصت قصہ ختم، یہ ہے تقلیدی ایمان کی مثال —— دوسرا استدالی جو دلائل سے ثابت ہو مثلاً ایک آدمی اُس مقام پر گیا اُس نے دیکھا کہ موٹریں کھڑی ہیں، پولیس موجود ہے، لوگ جمع ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی آیا ہے کیونکہ دلائل موجود ہیں۔ یہ ایمانی استدلالی ہے —— کشفی ایمان یہ ہے کہ اندر چلا جائے اور بچشم خود دیکھ آئے کہ وہ آدمی کرسی پر بیٹھا ہے وغیرہ وغیرہ —— اندر جا کر خود دیکھ آئے۔ تم جھوٹ بولتے ہو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔

گمراہی کا سبب یہ ہے کہ مسلمان حقیقت تک نہیں پہنچا۔ اگر حقیقت تک رسائی ہو جاتی تو پھر کوئی طاقت اسے گمراہ نہ کر سکتی (افسوس تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت میں بھی نہیں جاتے جہاں سے یہ گوہر مقصود ہاتھ آتا ہے، یقین وایمان کی دولت لازوال ملتی ہے) اسے کہتے ہیں حقیقت یعنی (انتہا تک پہنچنا)

معرفت سے مُراد ہے پہچان لینا۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ رستے میں میں جو کچھ ہے اس کے اسباب پہچانے گئے ہیں یہ معرفت ہے —— مگر میری تحقیق یہ ہے کہ جسکو جس وقت وہ چیز پوری حاصل ہو جائے معرفت حاصل ہو گئی —— شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت انتہا تک پہنچنا اسی کو تصوف کہتے ہیں۔ جسے یقین اور اطمینان ہوتا ہے وہ اس تک پہنچتا ہے۔

:- واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین :-

ماہنامہ المرشد چکوال کا سالانہ چندہ
صرف /۳۵ روپے ہے جن اصحاب نے
ابھی تک اپنا چندہ نہیں بھیجا براہِ مہربانی
اپنا چندہ جلد از جلد دفتر ماہنامہ المرشد چکوال روانہ فرمائیں
(ادارہ)

مسلسل

مولانا محمد اکرم مناروی

. . . . . اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝

اللہ جلّ شانہٗ کہ اس کائنات کا خالق ہے واحد اور یکتا ہے، بے مثل اور بے مثال ہے۔ جس نے زمین و آسمان، چاند اور ستاروں اور گلہائے رنگا رنگ کو تخلیق فرمایا۔ وہ انسان اور دُنیا اور ما فیہا کا بھی خالق ہے۔ اس نے انسان کو اس دنیا میں رہنے سہنے کا ایک ضابطہ اور نظام بھی عطا فرمایا ہے۔ تخلیق کے بعد انسان کو یونہی چھوڑ نہیں دیا گیا کہ وہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے اور جس وادی میں چاہے ہلاک ہو جائے۔ اسے دُنیا میں رہنے اس سے فائدہ اُٹھانے اور یہاں سے کمالات حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا اور ان کے حصول کے لئے ایک آئین، کچھ قواعد و ضوابط مقرر فرمائے۔ اس نظام کو اسلام سے موسوم کیا گیا۔

دنیا میں جہاں کچھ لوگ رہتے بستے ہیں وہ کسی بھی قوم، شہر یا ملک کے باسی ہوں اپنے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور وضع کرتے ہیں۔ وہ جس انداز سے اپنے شب و روز گزارنا پسند کریں، جس طرح سے اپنے معاشرہ کی تشکیل کریں، اپنے لئے کھانے پینے کے جو ذرائع اختیار کریں، اپنے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اپناتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں ہمیشہ سرفراز وہی معاشرہ رہا ہے جو طریقہ اختیار کرے جو خالق کائنات نے تجویز فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ کس چیز کا خالق، اس چیز کو استعمال کرنے والے کی نسبت اس کی خوبیوں اور خامیوں سے زیادہ واقف ہوتا ہے موٹر کا بنانے والا، موٹر رکھنے والے امیر آدمی کی نسبت اس کی اچھائیوں اور خرابیوں سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے

پھر جب کوئی چیز بنائی جاتی ہے تو اس کے استعمال کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے، مثلاً کاریگر نے جوتا پاؤں میں پہننے کے لئے بنایا ہے۔ یہ پاؤں کی حفاظت اور آرام کے لئے ہے۔ لیکن اگر کوئی شریف آدمی جوتے کی خوبصورتی دیکھ کر اُسے دستانوں کی جگہ ہاتھ پر چڑھالے تو وہی چیز جو آرام کے لئے بنائی گئی تھی اس کی ایذا کا سبب بن جائے گی۔ آپ ایک معمولی کرسی لے لیں کوئی بھی ذی شعور انسان اسے اُلٹا یا پہلو کے بل رکھ کر اس پر نہیں بیٹھتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس پر بیٹھنے کے لئے ایک قاعدہ ہے اس کے مطابق اسے استعمال کر کے ہی آرام حاصل کیا جاسکتا ہے ان چیزوں کے بنانے والے تو ہم جیسے انسان ہی ہیں۔ ان کی اس تخلیق میں ہم کچھ ردّوبدل کر سکتے ہیں اگرچہ اس کی بھی ساخت مجروح ہو جائے گی مگر اس کائنات کا بنانے والا تو وحدہٗ لاشریک ہے، بے مثل اور بے مثال ہے۔ اس کی تخلیق اور انسانی تخلیق میں بیّن فرق ہے، انسان کے بس کا روگ نہیں کہ وہ بھیڑیئے سے بھیڑ بنالے

اس دور میں انسانی ذہن نے ایسی ترقی کی ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ انسان نے ہر میدان میں حیرت انگیز ایجادات کی ہیں۔ مگر مچھر کا پَر ٹوٹ جائے تو ہوائی جہاز کا پَر تو کارخانے میں بن جائے گا مگر مچھر کا پَر بنانا محال ہے، ریل گاڑی تو بنائی جاسکتی ہے مگر ایک ادنیٰ سی کیڑی، کیڑی کے انڈے سے ہی پیدا ہوگی۔ اس طرح دنیا کی ادنیٰ سی ادنیٰ چیز اللہ تعالےٰ کی وحدانیت پر شاہد ہے، کوئی کارخانہ، اپنی ان خصوصیات کے ساتھ جن کو گھاس کا تنکا طبعی طور پر اپنے ساتھ لے کر زمین سے پھوٹتا ہے کوئی مشینری اسے اس طرح ترتیب نہیں دے سکتی، کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

گھاس کا ہر تنکا اس کی وحدانیت پر شاہد ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں سوائے اللہ کریم کے اور کسی کا محتاج نہیں ہے۔ سو اللہ کریم کی بنائی ہوئی اشیاء میں ہم نہ تو کسی میں کوئی تبدیلی لاسکتے ہیں اور نہ توڑ پھوڑ سکتے ہیں اگر کر سکتے ہیں تو یہی کہ پاؤں میں پہننے کے لئے بنایا گیا، جوتا ہاتھوں میں ڈالیں پھریں اور پھر شکوہ بر لب ہوں کہ آرام نہیں ملتا، زندگی بڑی بے چین ہے دُعا فرمائیں، بھلا دُعا یہاں کیا کام کرے گی جب تک جوتے کو ہاتھ سے اُتار کر پاؤں میں نہیں پہنے گا۔ تکلیف برقرار رہے گی۔ لہٰذا جب ایک ادنیٰ سی چیز کا غلط استعمال اس قدر تکلیف کا باعث بن سکتا ہے تو اگر ہم پوری زندگی کو مطلق العنان بنا کر اس وسیع کائنات میں غلط اور بے تکا استعمال شروع کر دیں گے تو

سکون کہاں ہوگا اور آرام کہاں سے آئے گا سہولت کیسے حاصل ہوگی۔ اس لئے اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ (اے وہ لوگو! جنھیں میری ذات پر اعتماد ہے، جنھیں میرے خالقِ حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں جنھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پختہ ایمان ہے جو قرآنِ کریم کو اللہ تعالےٰ کی کتاب سمجھتے ہوں)

"اسلام کو اس طرح قبول کرو کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔" تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، وضع قطع۔ کلام، اخلاق، کاروبار، ملازمت دُنیا کا کوئی کام، کوئی شعبہ ہو، اسلامی رنگ لئے ہوئے ہو، ایک مسلمان پر یہ حق بنتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر حرکت سے دیکھنے والا بغیر پوچھے کہہ سکے کہ یہ مسلمان نظر آتا ہے یہ ہے — اُدخلوا فی السلم کافۃ اسلام چند رسوم کا نام نہیں نماز افضل ترین عبادت ہے لیکن صرف نماز اسلام نہیں ہے، رمضان المبارک کے روزے افضل ترین عبادت ہے لیکن صرف روزے کو پورا اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ اسلام نام ہے زندگی کی ہر حرکت و سکون کا خدا اور اس کے رسولؐ کے تابع ہو جانا، چند رسومات اختیار کر لینا یا ان باتوں کو رسماً یا رواجاً یا وراثت کے طور پر اپنا لینا کافی نہیں اگرچہ اللہ کریم کا یہ بھی احسان ہے کہ ہمیں مسلمانوں کے گھر میں پیدا فرمایا۔ الحمدللہ! ہم نے بزرگوں کو جن سے ہم عقیدت رکھتے ہیں، نماز روزہ، حج زکوٰۃ ادا کرتے دیکھا ان سے حسنِ عقیدت کا یہ اثر ہے کہ کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی نماز ہم بھی پڑھ لیتے ہیں۔ کبھی تلاوت کر لیتے ہیں، کوئی کوئی نیکی نصیب ہو جاتی ہے۔ وگرنہ حقیقی اسلام کو ہم نے خلط ملط کر کے گڈ مڈ کر کے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک سکون کا سانس نصیب ہو تو آٹھ سانس جلتے اور سینے کو جلاتے ہوئے آتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر ایک قدم صحیح سمت میں اُٹھائیں تو یہ قدم گمراہی کے خارزار میں ہوتے ہیں۔

لہٰذا اسلام آخرت کے لئے ہی نہیں اس دنیا میں رہنے کے لئے بھی اس کی تعلیمات پر کما حقہٗ عمل کرنا ضروری ہے اس کے بغیر آرام و سکون ملتا ہی رہے گا۔

حیاتِ انسانی کے مختلف ادوار اور حالات ہیں ایک حالت وہ ہوتی ہے جب اس کا جسم ذرّات کی شکل میں کہیں اور دراز منتشر ہوتا ہے، خاک کے وہ ذرّات جو منقسم ہو چکے ہیں اس کا وجود تحلیل کرنے کے لئے وسیع کائنات کے سینے پر پھیلا دئے گئے ہیں۔ کوئی دُنیا کے کسی کونے میں کوئی کسی ملک میں ہے پھر اللہ کریم اس مٹی کو مختلف اشکال عطا فرماتے ہیں اصل میں یہ وہی ہے جس سے وجود کی

تعمیر ہوتی ہے کہیں تو وہ گنّے کی شکل اختیار کرتی ہے، کہیں اللہ کریم اسے غلّہ کی شکل میں تیار فرما دیتے ہیں، کہیں اسے روئی بنایا جاتا ہے اس سے بنولہ نکلتا ہے، اسے گائے بھینس کھاتی ہے پھر اس کے وجود میں دودھ بنتا ہے اتنی صورتیں اختیار کرنے کے بعد وہ دودھ ان اجزائے خاکی و آبی پر مشتمل جو کسی وجود کا جزو بدن بننے والے ہیں اور وہ پھرتا پھراتا اسی انسان تک آپہنچتا ہے جس طرح وجود کی تعمیر میں صرف ہونے والے اجزاء اس میں پیدا ہوتے ہی سمو دیئے گئے ہیں یہ اشیاء ہزار ہا شکلیں بدلنے کے بعد بالآخر یقیناً اور قطعی طور پر اس انسان کے پاس پہنچ جاتی ہیں جس کا وجود اس سے تعمیر ہونا مقدر ہو چکا ہے یہ کوئی اتفاقی یا حادثاتی نظام نہیں ہے۔ اگر حادثاتی یا اتفاقی ہوتا تو اب تک تباہ ہو چکا ہوتا۔ یہ ایک مبسوط پروگرام ہے، ہر ذرے کو اس کی ڈیوٹی تقسیم ہو چکی ہے ہر قطرہ آب کی نوکری لگ چکی ہے اسے چلانے والے۔ اسے پہنچانے، اسے بنانے والے اس میں رنگوں کی آمیزش کرنے والے اس پر مقرر ہیں۔ وہ اسے بناتے سنوارتے اور چلاتے ہیں۔ کھلیانوں، دکانوں اور منڈیوں سے گزرتے ہوئے اس انسان کے منہ تک پہنچا دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے دیکھئے انسان غذا کو کھاتا ہے اللہ کریم جتنے اور انسانوں کو اس کی پشت سے نکالنا چاہتا ہے۔ ان کی غذا کا ایک لطیف عنصر بھی اس کے منہ میں جاتا ہے، اللہ کی تقسیم کچھ ایسی ہے۔ اس کے اپنے جسم کے اجزا تو خون اور گوشت بنتے ہیں لیکن پیدا ہونے والے کے ذرات کو صلب میں محفوظ کر دیتا ہے وہ اس کے وجود پر صرف نہیں ہوتے اور اس ترتیب سے جب وہ لکھٹے چلے آتے ہیں تو اللہ کریم انہیں باپ سے ماں کی طرف منتقل فرما دیتا ہے تو جس کا نطفہ ماں کی امانت بن گیا اس کی غذا کو باپ سے کاٹ کر ماں کی طرف لگا دیتے ہیں۔ کھاتی تو ماں ہے لیکن اس کا جزو بدن وہی مٹی بنتی ہے جو اس کے اپنے نصیب کی ہے اور جو بچے کے حصّے کی ہے وہ اس کے پیٹ میں ایک معدے میں حل ہوتی ہے۔ ایک جگہ میں تحلیل ہوتی ہے ایک وجود کی رگوں میں نسوں میں خون دوڑتا ہے لیکن اس کے وجود پر وہی اجزاء چڑھتے ہیں جو اس کا حصّہ ہیں۔ بچّہ کا حصّہ اس کے پیٹ میں تقسیم ہو کر اس کی طرف چلا جاتا ہے جب اللہ کریم اس کی روح کو عالمِ امر سے ہے اس آمیزے کے ساتھ ماں کے پیٹ میں ملا دیتے ہیں تو روح کے لئے زندگی کا دوسرا دور شروع

ہوگیا۔ اس کی وہ زندگی ختم ہوگئی جس میں وہ پہلے تھا۔ ماں کے پیٹ میں آکر دوسرا دور شروع ہوا۔ جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو وہ زندگی منقطع ہو کر دورِ دنیا میں آجاتا ہے۔ یہاں اس کے لئے کام کرنے کے مواقع ہیں۔ اللہ کریم نے اس روح کو ایک وجود کا ہتھیار اور سواری دیدی ہے جس کا رزاق وہ خود ہے، رزق اس نے خود پہنچانا ہے۔ لیکن اسباب کا ایک حجاب سا ہے، ہم سمجھتے ہیں ایک خاص وجہ سے یہ کام ہوا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ جانور بڑا طاقتور ہے گاڑی کو کھینچ رہا ہے کوئی اس سے بھی باریک بین ہو تو کہتا ہے ڈرائیور نہ ہوتا تو انجن بھی کھڑا رہتا۔ کوئی اس سے بھی آگے دیکھتا ہے تو اس کی روح کو پالیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ڈرائیور کو بیٹھا رہنے دو اور الیکٹرک کرنٹ چھوڑ دو۔ سو یہ مختلف اسباب ہوتے ہیں کسی کی نگاہ تو اس ذاتِ حقیقی کو جا پہنچتی ہے جو پورے نظامِ کائنات کو چلاتا ہے۔ اور کوئی انجنوں، ڈرائیوروں، بھاپوں اور پہیوں کے چکر میں پڑا ہوا رہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اس پروگرام کو چلاتا ہے۔ روح ایک جسمِ لطیف تھا اسے جسمِ مادی کا ہتھیار دیدیا گیا۔ اس پر گرمی سردی کو مسلط فرمادیا اس کے ساتھ اس کی ضروریات وابستہ کردیں۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کا سامان کائنات میں بچھا دیا۔ اور اس کے لئے ایک امتحان بھی رکھ دیا کہ اپنی احتیاج کو میرے بنائے ہوئے قانون کے مطابق پورا کرتا رہے تو کامیاب ہے میں پھر تجھے فرش سے اٹھا کر عرش نشین بنادوں گا لیکن اگر میری اتنی رحمتوں کے باوجود میری خدائی میں تو مطلق العنان بنتا ہے تو تجھے اسفل السافلین میں لوٹا دوں گا۔ سو اس دنیا میں آکر اس کا دوسرا دور ختم ہوگیا۔ یہ پریڈ اس کے لئے ایک کورس کی حیثیت رکھتا ہے جب یہ ختم ہوتا ہے تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہے اسے ہم موت کا نام دیتے ہیں۔ تو گویا یہ موت زندگی کی اصل ابتدا ہے۔

الذی خلق الموت والحیوٰۃ۔ اللہ کریم نے موت وحیات کی تخلیق کا ذکر فرماتے ہوئے موت کو حیات پر مقدم رکھا ہے گویا موت آتی ہے تو اصل زندگی آغاز ہوتی ہے۔

لہذا میرے بھائی! ہمارا ہر کام ہماری ہمیشہ کی زندگی پر ایک نقش ثبت کرتا ہے۔ اگر تو وہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے مطابق ہو تو وہاں گل وگلزار بنتے ہیں اور اگر وہ خدا و رسولؐ کی نافرمانی پر مبنی ہوں تو وہ ایک شعلۂ جوالا کی صورت اختیار کرلیتا ہے جو لوگ اطاعت کرتے ہیں، عبادت کرتے ہیں۔ جو اپنی زندگی کو خدائے علیم وخبیر کے بنائے

ہوئے خانوں کے مطابق بسر کرتے ہیں، خدا شاہد، تاریخ گواہ ہے کہ ان کے لئے یہ دُنیا بھی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے چونکہ اس زندگی کا اس زندگی سے گہرا ربط ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو گویا وہ اس دُنیا میں نہیں ہوتا۔ مگر ماں کے وسیلے کے ساتھ اس دنیا سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اگر ماں کو سردی لگتی ہے تو بچہ پیٹ میں بھی سردی محسوس کرتا ہے۔ ماں بیمار ہوتی ہے تو بچہ پر بھی اس کا اثر مرتب ہوتا ہے اور صحت مند ماں کا پیٹ میں بھی بچے کی صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اس طرح اس کی زندگی کا برزخ یا آخرت کی زندگی کے ساتھ بھی گہرا رابطہ ہے۔ اس کی انتہا اس کی ابتداء ہے، جس طرح ہماری اُخروی زندگی تعمیر ہو رہی ہوگی اس کے اثرات یہاں بھی پہنچتے رہتے ہیں۔ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ ضرور منتقل ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بدکار شاہی محل بیٹھ کر بھی تڑپتا ہے اور اللہ تعالےٰ کا اطاعت گزار جھونپڑی میں مطمئن و مسرور ہوتا ہے۔ فرق یہی ہے کہ خدا کا عابد و زاہد بندہ محل میں ہو یا کھلے آسمان کی چھت کے نیچے ہو اس کا قلب و ضمیر مطمئن ہوتے ہیں اسے سکون و آرام میسّر ہوتے ہیں

ایسا بھی دیکھا گیا کہ جن کے سینے کو دشمن کے نیزے نے چھلنی کر دیا۔ جگر فگار ہو گئے، کلیجے پھٹ گئے۔ ان کے منہ سے نکلا "ربِّ کعبہ کی قسم" میں نے اپنے مقصد کو پا لیا"۔

کیسے پا لیا۔ بظاہر تو اس کا وجود ٹوٹ گیا، سینہ پھٹ گیا۔ ہمارے نزدیک تو وہ مر گیا۔ زندگی سے محروم ہو لیکن خالقِ کائنات فرماتا ہے یہ گمان بھی مت کرو۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا"۔ بخدا ان کی موت کے بارے میں سوچو بھی نہیں بل احیاءٌ" وہ تم سے زیادہ زندہ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو تمہاری نسبت لاکھوں درجہ بہتر اور مکمل بنا لیا ہے اس کی کیا وجہ ہے کہ بظاہر ہمیں دُکھ کی انتہا نظر آتی ہے مگر ان کی راحت کی انتہا بن گئی اس لئے کہ اللہ کریم کی کائنات میں اللہ تعالےٰ کے قانون کی حفاظت اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے انھوں نے اس پریڈ کو پورا کیا اور ابدی زندگی کو پا لیا اور ایک وہ ہے کہ شاہی محل میں ہے فرماں روا ہے، پہریدار محافظ نوکر چاکر سب موجود ہیں مگر خواب آور گولیاں کھائے بغیر نیند نہیں آتی کیوں؟ جو تعلق اس نے اُخروی زندگی سے قائم کر لیا ہے اس کی آنے والی لہریں اسے بیقرار رکھتی اور نیندیں حرام کر دیتی ہیں کما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

دیکھتا چلا گیا

سیلانی کے قلم سے

۱۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ قرآن کریم کی سالگرہ ہے۔ مسجدوں میں تراویح کی نماز ہو رہی ہے حفاظ بڑے انہماک سے تراویح میں قرآن مجید سنا رہے ہیں۔ شہر کے ایک پُر فضا حصے میں تزکیۂ باطن کا ایک مرکز ہے۔ مرکز کی وسیع اور عظیم الشان مسجد میں قرآن مجید سنانے کے لئے ایک حافظ صاحب تلاش کر کے لائے گئے۔ وہ قرآن مجید سُنا رہے ہیں مگر کیفیت یہ ہے کہ کوئی ڈیڑھ پارہ روز سناتے ہیں اور اس طرح فر فر سناتے ہیں کہ ساڑھے نو بجے ادھر ادھر فارغ ہو کر ایک دم غائب ہو جاتے ہیں۔

ایک رات کچھ "اہل دل" مقتدیوں کو کیا سوجھی کہ حافظ صاحب کا تعاقب کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ ان کی اس جلدی اور پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ تراویح سے فارغ ہو کر حافظ صاحب نے سائیکل لی اور یہ جا وہ جا۔ چند مقتدی بھی پیچھے اس امام کے مسجد سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر شہر کا ایک پُر رونق سینما ہال ہے حافظ صاحب وہاں پہنچ کے سائیکل سے اُترے ٹکٹ حاصل کیا اور منظر یہ بنا کہ ؎

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا ادھر اُدھر
پھر سر جھکا کے داخل میخانہ ہو گیا

اس کے بعد کی کیفیت کوئی خوشگوار نہیں۔ بس اتنا ظاہر کر دینا کافی ہے کہ انھوں نے حافظ صاحب کو پکڑا، جوتم پیزار شروع کی اور وہ ایک میل کی مسافت جوطے ہو گی کہ مقتدی جوتے مار رہے ہیں اور امام صاحب جوتے کھا رہے ہیں۔ غالب کے شعر میں استحصال بالجبر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ؎ کتنا نجستہ تھا اس کا سر کہ غریب : جوتیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

توقع تو یہ تھی کہ اس تربیتی مرکز کے لئے جو حافظ تلاش کیا جاتا ہے وہ کوئی اہل دل ہوتا، صفائے قلب ہو چکی ہوتی۔ قرآن کی حقیقت سے واقف ہوتا۔ عبادت اور تجارت میں تمیز کر سکتا مگر افسوس ہوا یہ کہ ؎

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

سچ فرمایا صادق و مصدوق نے کہ "کتنے قرآن پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ قرآن پڑھ رہے ہوتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت برسا رہا ہوتا ہے۔

۲۔ ٹی۔ وی سٹیشن ہے ایک مولانا اور پروڈیوسر کا مکالمہ ہو رہا ہے۔

پروڈیوسر:۔ مولانا! پرسوں سہ پہر کو "فہم قرآن" کے عنوان کے تحت آپ کے ارشادات ریکارڈ کرنے کا ارادہ ہے۔

مولانا:۔ بہت اچھا۔ میں وقت سے ذرا پہلے ہی آجاؤں گا۔

پروڈیوسر:۔ مولانا! کچھ سامعین کی بھی ضرورت ہو گی۔

مولانا:۔ ہاں تو ہم اپنے احباب کو بھی ساتھ لے آئیں گے۔

پروڈیوسر:۔ بہت اچھا! مگر جناب! کچھ خواتین سامعین کی بھی ضرورت ہو گی۔

مولانا:۔ یہ کام ذرا مشکل ہے مگر کوشش کریں گے۔

پروڈیوسر:۔ مگر یہ خیال رہے کہ خواتین میں کوئی خاتون باپردہ نہ ہو۔ برقعہ کا وجود نہ ہو، مولانا گہری سوچ میں پڑ گئے۔ کہتے ہیں چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں، باپردہ کا لفظ سن کر مولانا کا ذہن لفظ بے پردہ کی طرف مڑ گیا۔ پہلے تو دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ خواتین سے مراد خاتون خانہ نہیں بلکہ سبھا کی میری مراد ہے۔

پھر اردو کے شعرا کے شعر یکے بعد دیگرے ذہن میں گھومنے لگے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمین میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

(مگر اب تو غیرت قومی سے زمین میں گڑ جانے والے بھی واقعی زیر زمیں جا چکے)

پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

(واقعی ایسے "با پردہ" مردوں کی کوئی کمی نہیں)

پھر دل ہی دل میں گنگنانے لگے ؎

نہ رہ سکے گی لطافت جو زن ہے بے پردہ
سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

پھر مولانا وقت کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھے ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپنے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

یعنی صورت یہ بن گئی کہ ایک طرف مرد مؤنث دوسری طرف زن مذکر دونوں کا نتیجہ ایک جلسیا ہوا۔ لہذا کون کس سے پردہ کرے۔

خیر تو خاصے وقفے کے بعد:

مولانا :— جناب ایسی خواتین کو لانا ہمارے بس کا روگ نہیں آپ اہل فن ہیں۔ فنکاروں سے خوب واقف ہیں لہذا اس کا انتظام آپ ہی کر سکتے ہیں۔

پروڈیوسر :— ٹھیک ہے آپ بے فکر رہیں ہم انتظام کر لیں گے۔ شکریہ!

مولانا سلام وداع کہہ کے رخصت ہوئے۔

قرآن فہمی کی مجلس میں خواتین کی حاضری کو ضروری قرار دینے پر سیلانی کو محسوس ہوا کہ واقعی قرآن صرف مردوں کے لئے ہی کتاب ہدایت تو نہیں یہ عورتوں کے لئے بھی کتاب ہدایت ہے لہذا فہم قرآن کی مجلس میں عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔

مگر بے پردہ عورتوں کو یعنی مستورات کو نہیں بلکہ مکشوفات کو اہتمام اور تاکید کے ساتھ لانے پر اصرار کیوں۔ ہاں شاید اس لئے ہو کہ با پردہ عورتیں تو قرآن کے

احکام کو سمجھ چکی ہیں۔ اور صرف سمجھی ہی نہیں بلکہ عملاً قرآن کے ایک حکم تعمیل بھی شروع کر دی کہ مستورات میں شامل ہو گئیں۔ اور بے پردہ عورتیں ابھی قرآن سے بغاوت پر مُصر ہیں اس لئے ان کو قرآن سمجھانا مقصود ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ فہم قرآن کی مجلس کو عورتوں کی نمائش کی محفل بنانا مطلوب ہو۔

اور "گر" کی بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن فہمی کے لئے قرآن سے بغاوت کرنا ضروری ہے ایک اور امکان بھی ہے کہ قرآن فہمی کی اس مجلس سے سچ مچ کا فہم قرآن مقصد ہی نہ ہو بلکہ صرف فہم قرآن کا ڈرامہ کرنا یا ایکٹنگ کرنا مقصود ہو، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کی بات کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ایکٹنگ میں کوئی خامی نہ رہنے پائے۔

لہٰذا فہم قرآن کا عنوان جو دینی، علمی، ذوقی اور صوتی ہر اعتبار سے نہایت دلنواز عنوان ہے اس سے ضرور کام لینا چاہیئے اور کمالِ فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے اگر قرآن کو بازیچۂ اطفال بھی بنانا پڑے تو اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ: انما الاعمال بالنیات۔

اعلان

لنگر مخدوم کا اجتماع

۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء سے ۲۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء
تک رہے گا۔

گذشتہ سے پیوستہ

عن ابن عمرؓ عن النبیؐ نھی عن الغناء والاستماع الی الغناء ونھی عن النمیمۃ والاستماع الی النمیمۃ (رواہ الطبرانی)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گانے اور گانا سننے سے منع فرمایا ہے اسی طرح چغلی کھانے اور چغلی سننے سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: حقیقی محسن اور مربّی وہ ہوتا ہے جس کے دل میں دوسروں کے لئے خیرخواہی کے جذبات اس شدت سے موجود ہوں کہ مصیبت کسی پر آئے چوٹ اس کے دل پر پڑے۔ اور ہر نقصان دہ کام سے روکنا اور ہر مفید کام کی ترغیب دینا اس کا وظیفۂ حیات ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی نوع انسان سے بالعموم اور اہل ایمان سے بالخصوص جو خیر خواہی کا تعلق ہے اس کی شہادت رب العالمین نے اس انداز میں دی یہ دو خصوصیتیں اُبھر کے سامنے آگئیں ارشادِ باری ہے۔

عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خیر خواہی کا ثبوت آپ کے ہر ارشاد میں موجود ملتا ہے۔ حدیث بالا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چار باتوں کی ممانعت کا حکم پایا جاتا ہے:۔

(۱) گانا گانے کی ممانعت۔ یہ شغل یا عادت نہ تو کوئی تعمیری کام ہے نہ انسانیت کی ارتقا کے لئے کوئی مثبت خدمت ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے حق میں جو کہا

جا سکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ دل کو خوش کرنے، شوق پورا کرنے اور دفع الوقتی کا ایک ذریعہ ہے۔

مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب رنگین اور خوبصورت کیپسول ہیں جن کے اندر وہ زہر بھرا ہوا ہے جس تک لوگوں کی نظر نہیں پہنچتی دراصل یہ دل کو خوش کرنے کا نہیں بلکہ دل کو پریشان کرنے اور بے چین کرنے کا ذریعہ ہے یہ دفع الوقتی نہیں بلکہ تضیع اوقات کی ایک صورت ہے۔ لہٰذا حضورؐ نے اس مہلک مشغلے سے منع فرمایا ہے۔

(۲) گانے سننے کی ممانعت: گانا سننے کی لت عملی قوتوں کو بے کار کر دینے کا ایک سبب ہے بے راہ روی، عیاشی اور آوارگی اس عادت کے لازمی نتائج ہیں۔

نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ صدیاں پہلے جس تباہی سے انسانیت کو خبردار کیا تھا آج تہذیبی ترقی اور علمی ریسرچ کے بعد انسان اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ چنانچہ واٹنا کے ایک ماہر امراض نسوانی ڈاکٹر بارنارڈ اے بانر لکھتے ہیں:۔

"ساز، گانے کے بغیر بھی مرد اور عورت کے قلبی سکون کو جس طرح غارت کرتا ہے اس کا عام لوگوں کو بہت کم احساس ہوتا ہے یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ساز سے انسان کے حسّی جذبات میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر ان کے منفی میلانات میں تو شدید طوفان اُٹھنے لگتے ہیں۔ ساز اور گانے کا اثر صنفِ نازک پر زیادہ تیز اور شدید اور دیرپا ہوتا ہے۔"

پھر گانے کی ہلاکت آفرینیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"گانا عورت کے اندر عشق کے جذبات کو بڑھاتا ہے، بہت سے اچھے گھرانے کی عورتیں جو کبھی عزت و احترام سے اپنے خاندان میں مسرت کی زندگی بسر کر رہی تھیں انہوں نے گویّوں کے عشق میں اپنے خاوندوں اور اولاد کو خیرباد کہہ دیا ہے۔"

(WOMAN & LOVE)

گانا گانے اور گانا سننے کے اثرات جو انسان کی شخصی سیرت پر، انسانی اخلاق پر، انسانی معاشرے پر

اور انسانی تہذیب پر پڑتے ہیں یہ وہ زہر ہے جو زبان کے ذریعے کانوں کے رستے دل تک پہنچایا جاتا ہے جس سے لازماً انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سیرت پر گانے کے اثرات کا بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"گانا، انسان کے دل میں نفاق کو اس طرح پروان چڑھاتا ہے، جیسے پانی سبزی کو نشوونما دیتا ہے"

اور منافق وہ ننگ انسانیت وجود ہوتا ہے جسے کسی سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور جس کے ابدی ٹھکانے کے لئے ربّ العالمین نے جہنم کا سب سے نیچے کا حصّہ تیار کر رکھا ہے

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار

۳) چغلی کھانے کی ممانعت: چغلی کھانا ایک ایسی اخلاقی بیماری ہے جو کئی بیماریوں کا مجموعہ ہے۔ مثلاً

(ا) اخلاقی جرأت کا فقدان: انسان جس کی چغلی کھاتا ہے اس کے منہ پر اس کی کمزوری یا برائی بیان کرنے کی جرأت نہیں رکھتا اس لئے دوسروں کے سامنے چغلی کھاتا ہے۔

(ب) دوسروں کی تحقیر: کسی کی چغلی کھانے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس کے سامنے چغلی کھائی جا رہی ہے اگر قوت یا اثر کا مالک ہے تو اسے ذلیل و رسوا کرے گا اور اگر ایسا نہیں تو کم از کم اسے بُرا اور حقیر تو سمجھے گا جس کی چغلی کھائی جا رہی ہے۔

(ج) بدخواہی: اگر چغلی کھانے والے کے دل میں خیر خواہی کا جذبہ موجود ہوتا تو اس کی اصلاح کے لئے نہایت دلسوزی سے خود اس کے سامنے اس کی کمزوری بیان کرتا۔ ظاہر ہے کہ جذبہ سرے سے مفقود ہے۔

(د) دروغ گوئی: چغلی کھانے والا اس امر کا اہتمام کرتا ہے کہ اپنی بات کو وزن دار بنانے کے لئے بات کو بڑھا چڑھا کے مرچ مسالہ لگا کے بیان کرے اور اس غرض کو پورا کرنے کے لئے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

(ہ) مجرمانہ ذہنیت: چغلی کھانے والے کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میری بات تسلیم نہ کی گئی تو مجھے

رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اس لئے وہ انتہائی طور پر کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو معصوم ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کی رنگ آمیزی سے کام لے۔

غرض چغلی کھانے کی عادت وہ بیماری ہے جس کی ذیلی بیماریوں کو شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ چغلی سُننا: یہ عادت انسانیت کے لئے دو دھاری تلوار ہے اس کا ایک رُخ چغلی کھانے والے کی طرف ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ اگر چغلی سُننے والا خاموشی سے اور شوق سے سنتا ہے تو گویا چغلی کھانے والے کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور یہ حوصلہ افزائی کیا ہے اسے جھوٹ بولنے، دوسروں کی تحقیر کرنے، بدخواہی کرنے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور چغلی کھانے والے کی سیرت کو مستقل طور پر بگاڑنے کا عمل ہے اگر وہ شخص اس بیماری کا علاج کرنا چاہے تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ چغلی کھانے والے کو کہے میں یہ غیبت سننے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں فریق ثانی کو بُلواتا ہوں تم اس کے سامنے وہ سب باتیں کر دینا جو کہنا چاہتے ہو۔ یہ ایسا حربہ ہے کہ کسی کو چغلی کھانے کی جُرأت ہی نہیں ہوسکتی مگر جب چغلی سننا پُرلطف مشغلہ بن جائے۔ چغلی کھانے والے کو خاموش رہنے کی تلقین کون کرے اور کیوں کرے اس کا دوسرا رُخ خود اس کی ذات کی طرف ہوتا ہے جو بڑے مزے سے چغلی سُن رہا ہے۔ اس کا اپنا نقصان یوں ہو رہا ہے کہ وہ غیبت سُننے کے گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

پھر بغیر ثبوت کے اپنے ایک بے گناہ مسلمان بھائی کے خلاف اپنے دل میں نفرت کے جذبات پیدا کر رہا ہے یہی جذبات رفتہ رفتہ مستقل دشمنی کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ کم سے کم نقصان یہ ہوتا ہے کہ چغلی سُننے والے کے دل میں اس غائب بھائی کو حقیر، ذلیل اور بُرا سمجھنے کا یقین پیدا ہونے لگتا ہے۔ چغلی کھانا بلاشبہ بُری عادت ہے مگر چغلی سُننا اس سے بھی بُرا ہے کہ اس سے چغلی کھانے کی عادت کو شہ ملتی ہے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کا ایک مستقل معمول بن جاتا ہے پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ معیار خیر و شر بدل جاتا ہے بُرائی کو خوبی سمجھا جانے لگتا ہے اور خوبی بُرائی شمار ہونے لگتی ہے منافق جھوٹے اور مجرمانہ ذہنیت کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام سے ان اُمور کی وضاحت فرمائی ہے اس سے

صاف ظاہر ہے کہ جہاں اور جب حضور اکرمؐ کے اس حکم کی مخالفت کی جائے گی وہاں بگاڑ پیدا ہونا یقینی ہے اور حضور اکرمؐ کی نافرمانی اور مخالفت کا وبال اس پر مستزاد ہے۔

۲

عن انسؓ وعائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال صوتان ملعونان فی الدنیا والاٰخرۃ مزمار عند نغمۃ ورنۃ عند مصیبۃ (کنز العمال ۷: ۲۳۲)

ترجمہ: دو قسم کی آوازیں ایسی ہیں جن پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی گئی ہے۔ ایک تو خوشی کے موقعہ پر باجے گاجے کی آواز دوسرے مصیبت کے موقع پر آہ و بکا اور نوحہ کی آواز

تشریح: لعنت کوئی معمولی اور بے ضرر سا لفظ نہیں بلکہ لعنت کا مستحق ہونا انسان کی تباہی اور بربادی کا وہ آخری درجہ ہے جس کے بعد کسی اور تباہی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لعنت کا مفہوم ہے اللہ کی رحمت سے دُوری اور محرومی ہے۔ رحمت سے دُوری کا مطلب اس کے غضب کی لپیٹ میں آجانے کے سوا کیا ہو سکتا ہے اور اللہ کے غضب کی لپیٹ میں آنا انسان کی پرے درجے کی بدبختی ہے ــــ پھر اس لعنت یا رحمت سے دُوری کے بھی دو محل ہیں اوّل دنیا، دوم آخرت۔ دُنیا کی محرومی اور مصیبت دنیا ہی کی طرح عارضی اور فانی ہے۔ مگر آخرت کی محرومی ابدی اور دائمی ہے لہٰذا اس شخص سے زیادہ بدنصیب اور بدبخت کون ہو سکتا ہے جو آخرت میں اللہ کی رحمت سے دور رکھا جائے اور اس کے غضب کی لپیٹ میں آجائے۔

اس حدیث میں حضور اکرمؐ نے جو اسلوب بیان اختیار فرمایا اس سے اس بات کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ پہلے حضورؐ نے تنبیہ فرمائی بہت بڑے خطرے سے آگاہ فرمایا اور چوکنا کر دیا۔ پھر وہ بات بتائی جس کا نتیجہ وہ ہوگا جو پہلے بیان ہوا اس سے ظاہر ہے کہ وہ کام کتنا خطرناک ہے جس کا نتیجہ لعنت دنیا اور آخرت میں لعنت۔ اللہ کی رحمت سے دُوری اور اس کے غضب کی لپیٹ میں آجانا ہے۔

پھر فرمایا وہ ملعون بنانے والے دو کام ہیں۔ اوّل خوشی کے موقع پُرساز گانے کی آواز دوم۔ مصیبت کے وقت آہ و بکا اور نوحہ کی آواز۔ سبحان اللہ! دو جملوں میں معانی کی دُنیا سمو کے رکھ دی۔ انسان پر دو ہی حالتیں آیا کرتی ہیں۔ خوشی اور غم۔ گویا یہ دونوں حالتیں فطری ہیں

مگر ان حالتوں میں انسان کا جو ردِّ عمل ہوتا ہے۔ نتائج کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے۔ چاہے وہ ردِ عمل اختیار کرے جس کی وجہ سے ملعون قرار پائے جانے چاہئیے۔ وہ صورت اختیار کرے کہ اللہ کی رحمتوں کا مستحق بن جائے۔ اس میں انسان کو آزادی ہے۔

ان دونوں حالتوں میں ردِّ عمل کی مذکورہ بالا دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ تو حضور اکرم نے وہ صورت بیان فرما دی جو انسان کو ملعون بنا دیتی ہے۔ یعنی حضورؐ نے زہر کی نشاندہی فرما دی اور انسانی ردِ عمل کے میدان کو اتنی وسعت دیدی کہ صرف یہ زہر ہے باقی سب مباح۔

مگر زہر کے متعلق بھی تو دو رویے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ کسی جذبے کے تحت زہر کھا لیا پھر گئے تریاق کی تلاش کرنے دوسرا یہ کہ زہر کے قریب ہی نہ گئے۔ اب تریاق کی تلاش کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ زہر نہ کھانا ہی تریاق ہے ظاہر ہے کہ عقل کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی یہ دوسرا رویہ ہی اختیار کرے۔

اب ان دو امور کی نشاندہی فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ انسان کو دنیا میں اور آخرت میں ملعون بنانے والی چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ خوشی کے موقع پر ساز گانے کی آواز۔ ظاہر ہے کہ ساز گانے کی آواز خود بخود تو پیدا نہیں ہوا کرتی بلکہ کوئی انسان یہ آواز پیدا کرنے کی حماقت کیا کرتا ہے معلوم ہوا کہ ملعون وہ انسان ہے جو ساز گانے کا شغل کرے۔ اس ہلاکت آفرینیوں کا کچھ تذکرہ اس سے پہلی حدیث میں ہو چکا ہے۔

انسان کے ملعون بننے کا دوسرا موقعہ غم اور مصیبت کا وقت ہے، ایسے وقت انسان کا ردِ عمل اگر یہ ہو کہ وہ آہ و بکا اور نوحہ کرنے لگے تو وہ واقعی لعنت کا مستحق بن گیا کیونکہ آہ و بکا اور نوحہ کی آواز لعنت کی مستحق ہے۔

غم اور مصیبت میں آہ و بکا کا مطلب یہ ہے کہ:۔

۱۔ انسان، اللہ تعالےٰ کے فیصلے پر راضی نہیں۔

۲۔ اللہ تعالےٰ کے فیصلے کے خلاف انسان احتجاج کرتا ہے۔

۳۔ انسان یہ اعلان کرتا ہے کہ دنیا کا نظام اللہ کی مشیت کے مطابق نہیں بلکہ میری

پسند کے مطابق چلنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں اُمور انسانیت کے منافی ہیں اور اللہ تعالےٰ کے مقابلے میں بہت بڑی جرأت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بجا مگر سوال یہ ہے کہ غم اور مصیبت سے دل تو لازماً متاثر ہوتا ہے جیسے کسی نے کہا ہے ؎ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں پھر آدمی کیا کرے؟

اس عُقدے کا حل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور حدیث میں بیان فرما دیا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

" انسان کے فعل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک اختیاری دُوسرے غیر اختیاری۔ ان میں سے انسان سے صرف اختیاری اُمور کے متعلق باز پُرس ہو گی۔ یعنی سزا یا انعام کا مدار اختیاری اُمور پر ہے۔ غیر اختیاری اُمور پر کچھ مواخذہ نہیں۔

اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر غم کے موقع پر جو ردِ عمل ہو سکتا ہے اس کا تجزیہ کرو تو یہ معلوم ہو گا کہ:۔

۱۔ انسان کا دل متاثر ہوتا ہے۔ ۳۔ زبان پر شکوہ، نوحہ، آہ و بُکا کے الفاظ آتے ہیں

۲۔ آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں ۴۔ ہاتھوں سے بال نوچنا اور سینہ کوبی کرتا ہے۔

ان میں سے پہلے دو اُمور غیر اختیاری ہیں لہٰذا یہ فطری ہیں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔

آخری دو صورتیں اختیاری ہیں۔ یعنی چاہے تو خاموش رہے چاہے واویلا کرے، بال نوچے، سینہ کوبی کرے تو حضورؐ کا ارشاد کہ نوحہ اور آہ و بُکا کی آواز ملعون ہے اور ملعون بنا دیتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے اپنے اختیار کو استعمال کرنے میں اللہ اور رسول کی پسند کی پروا نہ کی تو یہ حرکت تمہیں ملعون بنا دے گی۔

عجیب بات یہ ہے کہ علمی ترقی کا اثر ہے یا تہذیب جدید کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن اور قلب میں لعنت اور ملعون کا وہ مفہوم ہی نہیں رہا جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے متعین فرمایا تھا۔ بلکہ لعنت ایک خوبی شمار ہونے لگی ہے اور ملعون ہونا ایک کوالیفکیشن شمار ہونے لگا ہے۔ (باقی صـ پر)

تصوف و سلوک

قسط
(۲)
از
مولانا عبدالباری ندوی

کثرتِ ذکر نفس ذکرِ الٰہی جس کی کثرت ودوام پر اتنا زور ہے کہ خود حضرت تھانوی ؒ نے "قصد السبیل" میں تصوف کے دو مرتبے ٹھہرا کر دوسرے یا اعلیٰ مرتبہ کا دوسرا جزو " باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا" ہی قرار دیا ہے ذکر کی یہ کثرت ودوام خود قرآن وحدیث میں منصوص و متواتر ہے ۔

اذکروا اللہ ذکراً کثیراً کے علاوہ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم کی مشہور آیت ہی سے نہ صرف کثرت بلکہ دوام بھی ثابت ہے اس لئے کہ آدمی کی کل تین ہی حالتیں ہو سکتی ہیں، یا کھڑا رہے گا، یا بیٹھا یا لیٹا اور ان تینوں حالتوں میں ذاکر رہنے کے معنی سوتے جاگتے ہمہ وقت اور ہر حال میں ذاکر رہنے ہی کے ہو سکتے ہیں۔ محاورہ میں بھی ہے کسی کی بات کا دھیان اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے رہنے کے معنی کثرتِ دوام ہی کے ہوتے ہیں ۔

نیز اس آیت سے ذکر قلب کا بھی استنباط فرمایا ہے۔ اس لئے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے آدمی بہت سے دوسرے کاموں یا باتوں میں لگا رہتا ہے جن کے ساتھ لسانی کے بجائے قلبی ہی ذکر ممکن ہے، خصوصاً لیٹنے میں جبکہ اس میں سونے کی حالت بھی داخل ہو، پھر لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ نے ذکر قلب کی منصوصیت کو اور بھی واضح فرما دیا ہے اس لئے کہ تجارت اور کاروبار کی مصروفیت کے اوقات میں بھی ذکر سے غافل نہ ہونا قلبی ذکر ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے ۔

راقم احقر کی فہم احقر میں تو جو ذکر قرآن وحدیث میں مامور ومنصوص ہے وہ دراصل ذکرِ قلب ہی ہے جس کے بغیر ذکر کی لغوی اور معنوی حقیقت متحقق نہیں ہو سکتی، ذکر کے لغوی معنی یاد یا یادداشت کے ہیں ، اور کسی شے کو جب یاد کیا جاتا ہے یا خود یاد آجاتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ذہن کو اس کی طرف متوجہ کیا گیا یا از خود متوجہ ہو گیا۔ جب

آدمی کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنا چاہتا ہے تو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی جانب ذہنی یا قلبی توجہ و التفات سے کام لے رہا ہے بلکہ زبان سے اس کا نام لینا سرے سے ضروری نہیں ہوتا۔ لہٰذا یاد یا ذکر در اصل نام ہی مذکور کو دل سے یاد کرنے یا اس کی طرف قلبی توجہ کا ہے، نہ کہ محض لسانی تلفظ کا۔ البتہ زبان سے نام لینا یا لسانی تلفظ قلبی توجہ کا عام اور آسان ذریعہ ہے، احادیث میں اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، رنج و راحت بیماری و صحت، عیادت و تعزیت، دعوت، رخصت وغیرہ غرض زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احوال و مواقع پر اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، نعمت و مشیت وغیرہ کی یاد دہانی کے لئے جو اذکار مامور و ماثور ہیں ان کا منشا یہی ہے کہ دن رات ہر حال اور ہر موقع کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق کی یاد دل میں تازہ ہوتی رہے۔

نیز "قصد السبیل" میں باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا تصوف کے اعلیٰ مرتبہ کا لازم جزو ٹھہرایا ہے۔ اس سے مراد بھی دل کی یاداشت اور توجہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی یاد دل میں اس طرح بس جائے کہ زندگی کی ہر حرکت و سکون میں اس کی رضا و ناراضگی اس کی محبت و عظمت اس کی سزا و جزا عذاب و ثواب پیش نظر ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بجز بشری سہو و خطا یا غفلت کے دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی یا چھوٹے بڑے معاصی کے قریب جانا اس کے لئے عملاً ناممکن ہوگا۔ "اکبر الاعمال" نام ایک وعظ میں ذکر کو سب سے بڑا عمل قرار دیکر ذکر کی اس حقیقت و علامت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ ذکر حقیقی سارے گناہوں سے بچنے اور اور تمام اوامر کو بجا لانے کو مستلزم ہے۔ فرمایا:-

"لوگ سوا لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کہنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ذکر نہیں۔ صورت ذکر ہے اور ذکر کے آثار سے ہے۔ ورنہ اگر اسکو حقیقت ذکر حاصل ہوتی تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ بعض سوا لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے مبرا ہیں۔"

ذکر اللہ کے مراتب

حال یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں بعض کو محض ذات حاکم کی یاد کافی ہوتی ہے اور جرائم سے بچنے کے لئے سزائے جہنم وغیرہ کی یاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بعض کو یہ بھی کہہ دینا ہے کہ تم جو چاہے کرو تم کو سزا نہ ہوگی۔ پھر بھی

اس کو حاکم سے ایسا تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کر سکتا۔ پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراضی کے اندیشے سے مخالفت نہیں کرتے۔ اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا بلکہ حیاء و شرم مانع ہوتی ہے۔ اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا یعنی حیاء و شرم پر بھی التفات نہیں ہوتا اس تعلق کا نام کچھ نہیں ہے

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

یا اس کا نام اگر کچھ ہے تو تعلق ذات ہے بہر حال مراتب ذکر میں تدریج ضرور ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کو کس قسم کا تعلق ہے، جیسا تعلق ہے اسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہیے

فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد

آگے ذکر کے اس فرق مراتب پر قرآن سے استشہاد ہے جس سے ایک تفسیری اشکال بھی حل ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"اور یہ فرق مراتب ہی تو ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو ذکر اپنی ذات سے متعلق کیا ہے جیسے "ولذکر اللہ اکبر" اور کہیں اسمائے حسنیٰ سے متعلق فرمایا ہے واذکر اسم ربک۔ یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقحم کہا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ تغیر عنوان ذاکرین کے اعتبار سے ہے مولانا روم اس فرق مراتب پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہست ولا یعقل نہ از جام ہو
نے زہو فانع لشدیر نام ہو

اس میں تنبیہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے جو ذکر اسمی سے ارفع و اعلیٰ ہے مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بیکار نہیں بلکہ نافع و مفید ہے جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو اسی کو غنیمت سمجھے ؎

از صفت و از نام چہ زاید خیال
واں خیالش ہست دلال وصال

یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ذکر لسانی بھی بیکار نہیں گو دل متوجہ نہ ہو، اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یہ غلط ہے میں نے اس کے رد میں کہا ہے ؎

ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

صاحبو! غضب یہ ہے کہ کھانے مٹھائی کا لینے سے تو اثر ہو کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے

اور اللہ کے نام میں اثر نہ ہوتا۔

ذکر کے درجات

خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو، دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے اسی طرح تعلق کا ایک درجہ یہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہہ دیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہوگی جو چاہو کرو تب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے نیز اگر یوں کہہ دیا جائے کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا تب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے۔ چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر کے دوران آواز آئی کہ جو چاہے کرے کافر ہی ہو کر مرے گا۔ وہ پریشان ہو گئے مگر ذکر نماز وغیرہ اعمال نہ چھوڑے بلکہ شیخ سے جا کر عرض کر دیا شیخ نے کہا کام میں لگے رہو۔ اس آواز سے پریشان نہ ہو یہ دشنام محبت ہے ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را

ذکر ہی جڑ ہے تمام شریعت و طریقت کی

اس کے ثبوت میں مثالاً چند آیات مذکور ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

اقم الصلوٰۃ لذکری۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے۔ حج کے بارے میں ارشاد ہے فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام وغیرہ۔ اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا۔ یہ تو اعمالِ ظاہری کی چند مثالیں تھیں۔ اب اعمال باطنہ میں غور کیجئے۔ تو وہاں بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم جس سے معلوم ہوا کہ خوف و خشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا ذکر اللہ ہو۔ یہ مقامات کا بیان تھا کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے ارشاد ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان کے دو درجے ہوتے ہیں ایک تو مقام ہے جو تصدیق و ایمان کا درجہ ہے اور ایک حال ہے جس کو سکون و انس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب قرار دیا ہے اس لئے اس کے عموم میں مقام و حال دونوں داخل ہیں۔ اگر عموم سے استدلال ہو تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے۔ کیونکہ واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ

ہی سے نصیب ہوتا ہے ؎

ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست
جز بہ خلوتگاہِ حق آرام نیست

خلوتگاہ حق سے مراد اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق ہے جو ذکر کی اعلیٰ قدر ہے"

ذکر کی حقیقت و صورت میں تمیز و فرق کے متعلق حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی تجدید و تحقیق یہ تفصیل باوجود کسی قدر تطویل کے ضروری و اہم تھی اس لئے کہ غیر محقق درویشوں نے رسمی اذکار یا محض صورتِ ذکر پر اتنا زور دیدیا ہے کہ حقیقت گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ماحصل حضرت کی اس مجددانہ تحقیق کا یہ نکلا کہ حقیقی ذکر وہ ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مذکور کا استحضار ہو۔ احقر نے اسی کو ابتدا میں یوں عرض کیا تھا کہ ذکر یا یاد کے معنی یہ ہیں کہ مذکور یعنی جس کی یاد آئے یا جس کو یاد کیا جائے قلب اور ذہن اس کی طرف متوجہ ہو۔

اور اللہ تعالےٰ کی اس حقیقی یاد و ذکر یا مذکور کی طرف توجہ اور اس کے استحضار کی علامت بلکہ لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ دیدہ و دانستہ نافرمانی یا معصیت کا ارتکاب یا فرمانبرداری و طاعت میں کوتاہی عملاً ناممکن ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات، رضا و ناراضی یا عذاب و ثواب ہمارے پیشِ نظر ہو اور پھر ہم اس کی پروا نہ کریں۔

اس حقیقی یاد یا ذکر ہی کا نام حدیث میں احسان ہے جو محققین کے نزدیک اسلامی تصوف کا حقیقی منصوص نام ہے کہ اللہ تعالےٰ کی بندگی اس طرح بجالاؤ گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالےٰ کی حقیقی یاد نصیب ہو جائے کہ گویا ہمہ وقت اس کے سامنے اور حضوری میں ہے یا کم از کم اس کی رضا و ناراضی عذاب و ثواب ہی کا استحضار رہے تو بشری بھول چوک کے علاوہ کسی چھوٹی بڑی نافرمانی کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے

ذکر اللہ کے حصول کا طریقہ

" واللہ یعلم ما تصنعون کے جملہ میں ذکر اللہ کی تحصیل کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ اس مضمون کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ اللہ کو میرے ہر عمل کا علم ہے اس مراقبہ سے ذکر اللہ بسہولت حاصل ہو جائے گی اور تمام اعمال کی تکمیل ہو جائے گی۔ اگر یہ مراقبہ راسخ ہو جائے تو معاصی سے اجتناب آسان ہو جائیگا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی حقیقت محض زبانی ذکر نہیں بلکہ وہ دوسری چیز ہے جو مراقبۂ علم سے مثلاً حاصل ہوتی ہے"

غرض اگر حقیقی تصوف کا حقیقی ذکر میسر ہو تو مومن مسلم کی زندگی کی ہر حرکت اور پرسکون اور ساری زندگی ذکر ہی ذکر اور اللہ تعالےٰ کی یاد ہی یاد ہے خواہ یہ یاد کسی درجہ اور کسی پیرائے میں ہو۔

ذکر کے باب میں ایک بڑی خطرناک غلطی

جس میں بعضوں کو ابتلاء ہے، یہ ہے کہ نفس ذکر ہی کو تمام اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے کافی جانتے ہیں۔ اور استدلال اس ابتلا سے بھی عجیب تر ہے کہ انا جلیس من ذکرنی سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر سے اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ سے قریب رہ کر اللہ کی نافرمانی یا معاصی میں کیسے مبتلا ہوگا۔ لہذا اور تدابیر کی ضرورت نہیں۔

"حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ذکر نفی میں خود تدابیر اصلاح بھی داخل ہے، تو بدون معالجۂ امراض کے ذکر ہی متحقق نہ ہوگا۔ دیکھو حصن حصین میں ہے بل کل مطیع اللہ فھو ذاکر۔ سُننے ذکر کے معنی ہیں یاد اور یاد تو سب طریقے سے ہوتی ہے نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے۔ کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعویٰ ہو نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے نہ اس سے ملے نہ اس کا کہنا مانے یہ ہرگز یاد نہیں تو جو ذکر بدوں اصلاح کے ہو وہ ایسی ہی یاد ہے۔"

یہ غلطی اچھے اچھے مشائخ میں اتنی عام ہے کہ مُرید کر کے بس کچھ اذکار کی تعلیم فرما کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ اعمال و اخلاق کی کوتاہیوں یا امراض پر نہ کوئی روک ٹوک نہ علاج و تدبیر بلکہ طالب اگر کسی مرض کو بیان کرے تو اس کے لئے بھی اکثر کوئی ذکر یا وظیفہ ہی اور تجویز فرما دیا جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کی رائج الوقت عامیانہ تصوف میں درحقیقت یہ بڑی اہم تجدید و اصلاح تھی کہ ان کی مجلس میں اعمال و اخلاق پر روک ٹوک دن رات رہتی۔

ایک طالب نے اپنے خط میں کوئی آسان وظیفہ یا طریقہ پوچھا جس سے طاعات میں ترقی اور معاصی سے اجتناب میسر ہو۔ جواب میں تحریر فرمایا:۔

"طاعات و معاصی دونوں اُمور اختیاریہ ہیں جن میں وظیفہ کو کچھ دخل نہیں۔ رہا طریقہ سو امور اختیاریہ کا طریقہ استعمالِ اختیار کے سوا اور کچھ نہیں۔"

ایک اور موقع پر فرمایا:۔

"نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے"

حضرت کی تجدید تصوف کا خلاصہ یہ دو باتیں ہیں

طاعت کا اہتمام اور دوام ذکر۔ ذکر میں جہر و ضرب کی نسبت ارشاد ہے:۔

"جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے اور حدیث میں جو وارد ہے اربعوا علی انفسکم۔ انکم لا تدعون اصم ولا غائبا۔ میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر محمول ہے اور بعض نے اس کو جہر مفرط پر محمول کیا ہے جس سے دوسروں کو ایذا پہنچے مثلاً سونے والوں کو تشویش ہو۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے منع فرمانے کی بھی یہی توجیہات ہیں۔ ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوٰۃ ہونا عہد نبوی میں اور سنن میں وتر کے بعد سبحان الملک القدوس مروی ہے۔ اور حکمت جہر میں یہ سمجھی گئی ہے کہ اس میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں کیونکہ اپنی آواز جو کان میں آتی رہتی ہے قلب آسانی سے ادھر متوجہ رہ سکتا ہے۔ مگر یہ فائدہ تو خفیف جہر سے بھی حاصل ہے۔

اسی طرح ضرب میں بھی قربت نہیں اس میں بھی ایسی طبی حکمت ہے وہ یہ کہ حرکت عنیفہ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے رقت اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے اطاعت و محبت میں جو مقاصد ہیں۔

پس ضرب، ذریعہ مقصود ہونے کی بنا پر مقصود بالغیر ہے۔ لیکن زیادہ ضرب سے قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے لہذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے"

اس دستور العمل میں جو مراقبہ تجویز کیا گیا ہے وہ مراقبۂ موت ہے۔ یعنی موت کے بعد سے حساب کتاب وغیرہ کے واقعات کا اس طرح تصور کرنا گویا وہ ہم کو پیش آرہے ہیں۔ اس کی بھی حکمت و غایت یہ ہے کہ:۔

"کثرت ذکر سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس مراقبہ سے دنیا کی نفرت پیدا ہو گی۔ یہی حب و بغض اس کا کام بنا دینے کے لئے ان شاء اللہ کافی ہوں گے۔

"بس تقویٰ کا التزام، اور یہ ذکر اور یہ مراقبہ کافی ہے عمر بھر اس پر مداومت رکھیئے تو آخرت میں تو ثمرہ یقینی ہے

اور اصل وعدہ عطائے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے لیکن دنیا میں بھی اگر اللہ تعالٰی کو منظور ہوگا تو اس کے قلب پر علوم عجیبہ و معارف اور واردات غریبہ و مواجیہ مثل ذوق وشوق محبت دانس، وانکشاف اسرار احکام و حسن معاملہ فیما بینہ وبین اللہ وغیرہ فائض ہوں گے ؎

بینی اندر دل علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا"

خالی اشغال و مراقبات کو تصوف اور مقصود تصوف سمجھنے والے صوفیہ اور محض ظاہری اور بڑے بڑے گناہوں کو گناہ سمجھنے والے "دیندار" علما اور ارباب دعوٰی دونوں کا حال پیش نظر رکھ کر پھر ایک مرتبہ اوپر کی سطریں پڑھو تو معلوم ہوگا کہ تصوف کے معتقد اور منکر دونوں نے نہ طریقت کو سمجھا نہ شریعت کو۔

(بشکریہ ماہنامہ الفرقان)

لقیہ: چراغ مصطفوی ص

آپ کہیں گے وہ کیسے۔ میں کہوں گا وہ ایسے کہ یہ میوزیکل کنسرٹ، یہ آرٹ گیلریاں، گانے والوں کو بڑے بڑے خطابات، یہ سازندوں کی پذیرائی - یہ آہ و بکا اور نوحہ کرنے کی مجلسیں یہ سینما کی بہاریں، یہ ریڈیو پر طبلے کی تھاپ بر ٹی، وی میں لہرا کے اور بل کھا کے گانے بجانے کے مناظر جو خوبی اور عبادت شمار ہونے لگے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک لعنت کے معنی اللہ کی رحمت اور ملعون کے معنی اللہ کا محبوب ہونا ہی قرار پایا ہے جبھی تو اکثر مسلمان اسی فکر میں گھلتے جا رہے ہیں کہ میں کسی طرح سب سے بڑا ملعون بن جاؤں ؎

تھا جو ناخوب تبدریج خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اور ملعون بنانے والے ادارے دھڑا دھڑ کھل رہے ہیں۔

● جہاں حق متعین ہو وہاں اہل باطل کو اتفاق پر مجبور کرنا چاہیئے۔ کہ تم اہل حق سے نزاع نہ کرو ۔

(اعـت)

شیطان کے مکر و فریب

فیض الرحمٰن اسلام آباد

ایک مشہور حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان لگا رہتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ کیا آپؐ کے ساتھ بھی شیطان لگا ہوا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں۔ مجھ کو بھی ایک شیطان چمٹا ہوا ہے۔ مگر مجھ کو خدا تعالےٰ نے اس پر غالب کر دیا ہے۔ اور اب میں اُس کے شر سے سلامت رہتا ہوں۔ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اور اب وہ مجھے نیکی بھی بتاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں فرمایا کہ شیطان عمرؓ کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ جس جنگل میں عمرؓ پہنچتے ہیں۔ وہاں سے شیطان بھاگ کر دوسرے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ شیطان جب ان کو دیکھتا ہے تو دیوانہ ہو جاتا ہے روایات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ابلیس پر لعنت کی۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ابلیس کی بائیں پسلی سے ایک عورت پیدا کی اور پھر ان کی اولاد کثیر تعداد میں پیدا ہوئی جو بڑھ کر تمام جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں، جزیروں، ویرانوں ریگستانوں، غلاظت کے مقامات، قبروں، گھروں غرضیکہ سب جگہوں میں پھیل گئی۔ ابلیس نے ان کو مخصوص فرائض سونپ رکھے ہیں۔ مثلاً مدحش کے ذمے یہ کام ہے کہ علماء حضرات کو ہوا و ہوس کی ترغیب دیتا رہے۔ حدیث کی تقریری نمازیوں پر ہے۔ یہ اُن کو نماز بھلاتا ہے، کھیل میں لگاتا ہے اور اُن پر جمائی اور اُونگھ لاتا ہے، زلنبون کو بازاروں پر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ لوگوں کو کم تولنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ مبتر کا کام مصیبت میں گرفتار لوگوں کو واویلا پر اُکساتا ہے تاکہ مصیبت پر صبر کرنے سے جو بے بہا اجر متوقع تھا اُس کو ضائع کر دیا جائے۔ منشوط لوگوں کو کذب، غیبت اور عیب جوئی پر اُکساتا ہے، واسم کا کام مردوں اور عورتوں کو زنا کی ترغیب دینا ہے۔ اعور انسانوں

کو چوری کی تلقین کرتا ہے۔ کہ چوری سے تمہارا فاقہ دُور ہو جائے گا۔ نیز قرض بھی اُتار سکو گے۔ چوری کے بعد پھر توبہ کر لینا۔ جس شیطان کی ڈیوٹی وضو کرنے والوں پر ہے اس کا نام ولہان ہے۔

ابلیس نے اللہ تعالےٰ سے مہلت لے رکھی ہے کہ میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا اور جہنم کی طرف لے کر جاؤں گا۔ انسان کمزور اور کم عقل ہے۔ اس لئے شیطان کے مکر و فریب کا شکار جلدی ہو جاتا ہے، شیطان کی عمر ہزاروں سال ہے۔ ویسے ہی اس کا تجربہ وسیع اور متنوع قسم کا ہے، ایسے ایسے داؤ پیچ جانتا ہے کہ عام انسان تو کجا بڑے بڑے بزرگ بھی اس کی مکاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس کے چیدہ چیدہ اور مشہور ہتھکنڈوں سے واقفیت حاصل کی جائے۔ یحییٰ ابن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ شیطان فارغ اور تو مصروف ہے، شیطان تجھے دیکھتا ہے مگر تُو اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ تُو شیطان کو فراموش کر دیتا ہے، حالانکہ شیطان تجھے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ مزید برآں تیرا نفس خود تیرا مخالف اور شیطان کا مددگار ہے۔ لہٰذا اُن سے یعنی نفس اور شیطان سے جنگ اور اُن کو مغلوب کرنے کی سعی اور کوشش سخت ضروری ہے ورنہ پھر ہلاکت اور تباہی سے بچنا بہت مشکل اور دُشوار ہے۔

موت کے وقت شیطانی دھوکا

حدیث شریف میں ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو (مسلمان) قریب المرگ ہوں اُن کے پاس رہو اور اُن کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔ اور ان کو جنت کی بشارت دو، کیونکہ اس وقت میں بڑے بڑے عقلمند مرد و عورت حیران ہو جاتے ہیں اور شیطان اس وقت انسان کے ساتھ سب اوقات سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

امام شعرانیؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات کے مطابق جب انسان نزع کے عالم میں ہوتا ہے تو دو شیطان اس کے دائیں اور بائیں آکر بیٹھتے ہیں داہنی جانب والا اس کے باپ کی شکل میں آتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ بیٹا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تُو نصاریٰ کا مذہب اختیار کر کے مرنا۔ کیونکہ وہی بہترین مذہب ہے۔ اور بائیں جانب والا شیطان میت کی ماں کی شکل میں آتا ہے اور کہتا ہے بیٹا میں نے تجھے اپنے پیٹ میں رکھا دودھ پلایا۔ گود میں پالا ہے میں تجھے نصیحت کرتی ہوں کہ یہود کا مذہب اختیار کر کے مرنا، کیونکہ وہی بہترین مذہب ہے (امام غزالیؒ نے بھی تقریباً یہی مضمون لکھا ہے) اگر میت نے ان کی بات نہ مانی تو دوسری جماعت اسی طرح دوسرے احباب و اقرباء کی شکل میں آکر کہتی ہے

کہ تو نصاریٰ کا مذہب اختیار کرے۔ کیونکہ یہی وہ مذہب ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ڈالتے ہیں۔ پس جس کی قسمت میں دینِ حق سے پھر جانا لکھا ہوا ہے۔ وہ اس وقت ڈگمگا جاتا ہے۔ اور باطل مذہب کو اختیار کر لیتا ہے۔ اور جس شخص پر حق تعالےٰ کی رحمت ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالےٰ اُس کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ اور رحمتِ خداوندی بذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام شیاطین کو دفع کر دیتی ہے۔ اس وقت بسا اوقات میت فرطِ خوشی کی وجہ سے تبسم کر دیتی ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعۂ وفات

امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ فرماتے ہیں۔ کہ جب امام کی وفات کا وقت آیا۔ میں آپ کا جبڑا باندھنے کے لئے ہاتھ میں کپڑا لئے ہوئے تھا۔ آپ کا یہ حال تھا۔ کہ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اور پھر ہوش میں آتے اور فرماتے لَا لَعَبْدُ۔ لَا لَعَبْدُ جب کئی مرتبہ اس طرح سے ہوا۔ تو میں نے دریافت کیا کہ ابا جان آپ یہ فرما رہے ہیں۔ فرمایا۔ کہ شیطان میرے سامنے کھڑا ہوا ہے اور دانتوں میں انگلیاں دیتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ افسوس اے احمد تم ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ میں اُس کے جواب میں کہہ رہا ہوں۔ لَا لَعَبْدُ یعنی ابھی نہیں چھوٹا جب تک موت نہ آجائے (کیونکہ جب تک سانس باقی ہے میں تیرے مکر سے غافل و بے پرواہ نہیں) شیطان کی غرض یہی تھی کہ اس وقت ان کو بے خوف کر کے کوئی حملہ کرے۔ مگر حضرت امامؒ نے اس کے مکر کو سمجھ لیا۔

موت کے وقت کبیر شیطانی سے محفوظ رہنے کی تدبیریں

۱۔ سب سے بڑی تدبیر تو ایمان کی پختگی ہے جس قدر استقامت کا درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔ اُسی قدر شیطانی حملوں سے محفوظ رہے گا اور رحمتِ حق حفاظت فرمائے گی۔ ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ تمام صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچے۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کرے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کا راستہ اختیار کرے۔ معاملات کو درست رکھے۔ متوسط درجہ یہ ہے کہ اگر غلطی اور غفلت سے گناہ کر بیٹھے تو فوراً توبہ کرے اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایمان پر آخر وقت تک مضبوطی سے جما رہے اس سے بھی رحمتِ الٰہی اور فرشتوں کی امداد کی توقع ہے

لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ کسی شدید گناہ کے وبال کی وجہ سے محروم ہو جائے۔ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ خاتمہ اُسی شخص کا خراب ہوتا ہے۔ جس کا عقیدہ خراب ہو اور کبیرہ گناہوں کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ نیز گناہوں پر اصرار کرتا ہو۔

۲۔ جنابت کی حالت میں بغیر وضو کئے ہوئے تھوڑی دیر بھی نہ رہے۔ حضرت میمونہ بن سعدؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا غسل کی حاجت والا آدمی بغیر غسل کے سو رہے۔ تو کوئی حرج ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے پسند نہیں کہ وہ بلا وضو کئے سو جائے۔ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں سوتے ہوئے موت آجائے تو اُس کے پاس جبرائیل علیہ السلام نہ آویں گے (البتہ اگر وہ وضو کرلے، یا وضو ہر وقت نہ ہو تو تیمم کرلے۔ اس سے فرشتوں کی نفرت زائل ہو جاتی ہے)

۳۔ اپنے لباس اور مکان کو ایسی چیزوں سے پاک رکھے جو ملائکہ رحمت کے داخل ہونے میں مانع ہیں۔ مثلاً تصویر، کتا، غسل کی حاجت والا آدمی بجنے والا زیور وغیرہ۔

۴۔ اطاعت والدین کی عادت ڈالے۔ کیونکہ والدین کی نافرمانی کرنے والا رحمتِ حق سے محروم ہوتا ہے، اور سُوءِ خاتمہ کا خطرہ ہے

۵۔ مرنے والے کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کریں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ جب تم مرنے والے کے پاس بیٹھو، تو اس پر کلمہ پڑھنے کے لئے اصرار نہ کرو۔ کیونکہ وہ کبھی زبان سے کہہ لیتا ہے۔ اور کبھی ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ کبھی قلب سے (اور اتنا بھی کافی ہے۔

۶۔ مرنے والے کے پاس کچھ قرآن شریف پڑھا جائے، بالخصوص سورۂ یٰسین، حدیث میں ہے کہ جب کسی میت کے پاس سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے، تو اللہ تعالےٰ اُس پر آسانی کردیتے ہیں ایک اور روایت کے مطابق سورۂ رعد کا پڑھنا مذکور ہوا ہے۔

وساوس اور خطرات

اللہ تعالےٰ نے انسان کے قلب پر ایک فرشتے کو متعین کردیا ہے جو اس کو خیر کی دعوت دیتا رہتا ہے اس کو حلیم کہتے ہیں اور اُس کی دعوت کو الہام۔ ایسے ہی ایک شیطان کو بھی اس کے اوپر مسلط کردیا ہے۔ اُس کا نام وسواس ہے اور اُس کی دعوت کو وسوسہ کہا

جاتا ہے۔ جو خیال قلب میں ابتداءً پیدا ہو اس کو خاطر کہتے ہیں۔

خواطرِ خیر اور خواطرِ شر میں تمیز کرنیکا طریقہ

۱۔ جو خاطر قلب پر وارد ہو اُس کو شریعت کی میزان پر پرکھیں۔ اگر شرع کے مطابق ہو تو خیر ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو شر ہے اگر اس تقابل سے خاطر کی نوعیت واضح نہ ہو سکے۔ تو

۲۔ سلف صالحین کے اقوال و افعال سے موازنہ کرو۔ اگر اس خاطر میں سلف صالحین کے افعال کی اقتداء پائی جائے، تو یہ از قسمِ خیر ہے، بصورتِ دیگر شر ہے

۳۔ اگر مندرجہ بالا دو موازنوں سے بھی نوعیت واضح نہ ہو سکے، تو نفس کا ردِّ عمل دیکھیں کہ یہ خطرہ نفس کو طبعی طور پر مرغوب ہے یا ناپسند ہے اگر نفس اس کی طرف طبعاً وفطرتاً مائل ہوتا ہے تو یہ خاطر شر ہے کیونکہ نفس کو فطرتاً شر کی طرف رغبت ہوتی ہے (جب تک کہ نفسِ امارہ نفس مطمئنہ میں نہ تبدیل ہو جائے)

خواطرِ شر اور خواطرِ خیر کا مزید تجزیہ

خاطرِ شر کی پہچان

۱۔ اگر وسوسہ پختہ طور پر ایک ہی حالت میں محسوس ہو۔ تو یہ ہوائے نفس ہے (جیسے کسی لذیذ کھانے کی مسلسل خواہش) ہوائے نفس کی مثال چیتے کی طرح ہے کہ جب وہ مقابلہ پر اُتر آتا ہے تو شکست فاش یا تمام ذرائع منقطع ہوئے بغیر پیچھے نہیں ہٹتا۔ اور شیطان کی مثال بھیڑیئے کی طرح سے ہے کہ ایک جانب سے بھگا دو تو دوسری جانب سے آئے گا۔

۲۔ اگر وسوسہ تردّد اور اضطراب کی شکل میں ہو تو یہ شیطان کی جانب سے ہے نیز اگر وسوسہ ابتدائی طور پر نمودار ہوا ہے اور کسی گناہ کے ارتکاب کے بعد واقع نہیں ہوا تو اس کا محرک شیطان ہے۔ اکثر وساوس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اُن کی ابتداء شر اور برائی کی دعوت کے ساتھ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر ذکر اللہ کے ساتھ وسوسے میں کسی قسم کی کمزوری یا کمی واقع ہونے لگے تو یہ وسوسہ شیطانی ہے۔ اگر اللہ کے ذکر کے بعد بھی وسوسہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ قائم رہے تو یہ ہوائے نفس ہے کیونکہ نفس کی یہی خصلت ہے

خواطرِ شیطانی کی پہچان

۱۔ اگر وہ وسوسہ قوی اور پختہ ہو تو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ہے۔ اگر اس میں شبہ اور تردد ہے۔ تو یہ فرشتہ کی طرف سے ہے کیونکہ فرشتہ بمنزلہ ناصح کے ہے۔ کہ بندہ کے پاس ہر جانب سے آسکتا ہے۔ اور ہر نصیحت کی بات پیش کرتا ہے کہ شاید قبولیت کی رغبت اور ترغیب ہو۔

۲۔ اگر وہ خاطر طاعت کے بعد بھی قائم ہے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہے اور اگر ابتدا میں تھا۔ لیکن بعد از طاعت کم ہو گیا تو فرشتہ کی جانب سے ہے

۳۔ اگر وہ کسی گناہ کے ارتکاب کے بعد محسوس ہوا ہے تو اللہ تعالےٰ کی جانب سے گناہ کی بدبختی ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

۴۔ اگر یہ وساوس یا خواطر اصول اور اعمال باطنی کے بارے میں ہیں تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ اور اگر فروع یا اعمالِ ظاہری کے بارے میں ہیں تو اکثر و بیشتر فرشتے کی طرف سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ فرشتہ بندہ کے باطنی امور سے واقف نہیں ہوتا۔

۵۔ خاطرِ خیر کی ایک خاص قسم جو کہ شیطان کی طرف سے اس نیت کے ساتھ پیدا کی جاتی ہے کہ بعد ازاں بندہ سے بڑی برائی کا ارتکاب کرواؤنگا۔ اس کو پہچاننے کے لئے نفس کا ردِ عمل دیکھیں۔ اگر نفس میں ایسی نشاط پائے کہ جس میں خشیت نہیں۔ ایسی عجلت پائے کہ جس میں تاخیر نہیں ایسی سلامتی پائے کہ جس میں خوف و خدشہ نہیں۔ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ وسوسۂ شیطانی ہے۔ اور اس سے اجتناب کرنا چاہیئے اور اگر نفس کا معاملہ برعکس پائے یعنی خشیت ہو مگر نشاط نہ ہو، تاخیر ہو مگر عجلت نہ ہو خوف و خدشہ ہو۔ مگر سلامتی نہ ہو۔ ایسے ہی انجام سے اندھا و بہرا نہ ہو۔ تو یہ خاطر اللہ تعالےٰ کی جانب سے یا فرشتہ کی طرف سے ہے۔

جو علوم قلب ادراک کرتا ہے (خواہ وہ نئے ہوں یا پہلی باتوں کا تذکرہ) اُنہیں کو خواطر کہتے ہیں۔ ارادوں کے محرک یہی خواطر ہوتے ہیں خواطر سے رغبت متحرک ہوتی ہے، رغبت سے عزم اور نیت اور نیت اعضاء کو حرکت دیتی ہے دل کی نرمی جس سے وہ خواطر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے توفیق کہلاتی ہے اور اگر وسوسۂ شیطان کو قبول کرلے تو اُسے خذلان کہتے ہیں۔

وسوسہ پر کب مواخذہ ہوتا ہے

وساوس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ سالک کو علم ہونا چاہیئے کہ خطرہ کس کی طرف سے ہے یعنی اللہ تعا

کی طرف سے، فرشتہ کی طرف سے، نفس کی طرف سے یا شیطان کی طرف سے۔ نیز یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کونسا خطرہ خیر ہے اور کونسا شر سے تعلق رکھتا ہے۔ جب اچھے بُرے خطرات کی تمیز ہو جائے گی۔ تو سالک کے لئے ہدایت کے راستہ پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ وساوس اور خطرات کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے۔ ایک وسوسہ تو اختیاری ہوتا ہے اور ایک غیر اختیاری۔ مثلاً راہ چلتے میں کسی عورت پر نظر پڑ گئی۔ اس پر تو کوئی گناہ نہیں لیکن اگر اس عورت کا بار بار تصوّر کر کے لذت حاصل کی جائے تو یہ خیال یا تصوّر (یا وسوسہ) قابلِ مواخذہ ہو گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نفس (بھی) زنا کرتا ہے اور اس کا زنا یہ ہے کہ) تمنا کرتا ہے۔ اور اشتہا کرتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تلب میلان کرتا ہے۔ اور تمنا کرتا ہے (اور ظاہر ہے کہ التذاذ بغیر اشتہاء و میلان کے نہیں ہو سکتا۔ پس یہ التذاذ بھی زنا ہوا) وسوسہ کب قابلِ مواخذہ ہوتا ہے اور کس حد تک بلا مواخذہ ہوتا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ا) جب کوئی بات قلب میں ابتداءً واقع ہوئی اور اس نے نفس میں کوئی حرکت نہیں کی اس کو ہاجس کہتے ہیں اگر اس شخص کو توفیق ہوئی اور وہ شروع ہی میں اس خیال کو دفع کر دیا۔ تو کوئی مواخذہ نہیں۔

(ب) اگر وہ خیال نفس میں دورہ کرنے لگے یعنی وقوع ابتدائی کے بعد نفس میں اس خیال کی آمد و رفت ہونے لگے مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا کوئی منصوبہ نفس نے نہیں باندھا۔ اس کو خاطر کہا جاتا ہے۔

(ج) جب نفس کرنے نہ کرنے کا منصوبہ باندھنے لگا۔ اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوئی۔ اس کو حدیثِ نفس کہتے ہیں۔

(د) پھر جب نفس میں فعل یا عدم فعل کا منصوبہ ترجیح فعل کے ساتھ ہونے لگا۔ لیکن وہ ترجیح قوی نہیں ہے بلکہ مرجوح ہے، جیسے وہم ہوتا ہے۔ اس کو ہم کہتے ہیں۔

(س) پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا۔ یہاں تک کہ جازم مُصمّم بن گیا۔ کہ ترک پر قابو نہیں رہا اس کو عزم کہتے ہیں۔

وساوس کے درج بالا پانچ مراتب میں سے پہلے تین درجے (یعنی ہاجس، خاطر۔ اور حدیثِ نفس) ایسے ہیں کہ ان پر نہ تو مواخذہ ہے اگر شر میں ہے۔ اور نہ ثواب ہے اگر خیر میں ہے۔ البتہ آخری دو درجوں (یعنی ہم اور عزم) پر ثواب بھی ہوتا ہے اگر وہ خیر میں ہے اور گناہ بھی ہوتا ہے اگر وہ شر میں ہے

کثرتِ وساوس کا علاج

بعض اوقات سالک کو کثرتِ وساوس سے پریشان کن کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، شیطان جب کسی بندہ کو اللہ تعالےٰ کی طاعات میں مستقل مزاجی کے ساتھ جما ہوا دیکھتا ہے۔ اور اپنے تمام ہتھکنڈوں اور مکر و فریب کی چالوں کو آزمانے کے باوجود ناکام و نامراد رہتا ہے، تو پھر طرح طرح کے وسوسے ڈال کر سالک کو پریشان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی وسوسہ مسلسل اور لگاتار قلب میں ڈالتا ہے اور کبھی کبھی مختلف نوعیت کے وسوسے لیکن کثرت کے ساتھ القاء کرتا ہے مقصد دونوں صورتوں میں سالک کو پریشانی میں مبتلا کر کے تضیع اوقات کرنا ہے، تاکہ منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کی رفتار کو کم کیا جا سکے۔ اور اگر ممکن ہو تو بھول بھلیوں میں اُلجھا کر راستے سے بھٹکا دیا جائے اس سلسلے میں محققین صوفیائے کرام نے بعض کلیات اور طریقے بتائے ہیں جن کو سمجھ کر عمل کرنے سے سالک بخوبی ایسی صورتِ حال سے نمٹ سکتا ہے۔ چند اُصول اور قاعدے درجِ ذیل ہیں

۱۔ شیطان اسی قلب میں وسوسے ڈالتا ہے جس میں ایمان ہوتا ہے، جیسے چور اُسی گھر میں نقب لگاتا ہے جس میں دولت ہوتی ہے لہٰذا خطرات پر بجائے پریشان اور مغموم ہونے کے عقلاً خوش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ شیطان کا قلب میں وسوسے ڈالنا قلب کے اندر دولتِ ایمان ہونے کی علامت ہے، جب سالک خوش ہوگا تو شیطان مایوس ہو کر وسوسے ڈالنا ہی چھوڑ دے گا۔ علاوہ ازیں خطرات پر عقلاً خوش ہونے سے قلب میں قوت پیدا ہوگی۔ اور یہ قوت بھی دفع خطرات میں معین ہو جائے گی۔

۲۔ خطرات کی کیفیت بجلی کے تار کی سی ہے کہ اگر اس کو اپنی طرف کھینچنے کی نیت سے ہاتھ لگایا جائے تب بھی وہ لپٹتا ہے اور اگر ہٹانے کی نیت سے ہاتھ لگایا جائے تب بھی وہ لپٹتا ہے۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگایا جائے۔ اسی طرح خطرات اور وساوس سے امن کی صورت یہی ہے کہ اُن کی طرف التفات ہی نہ کیا جائے۔

۳۔ خطرات کو دفع کرنے کے درپے ہرگز نہ ہونا چاہیئے ورنہ وہ اور زیادہ ہجوم کرنے لگتے ہیں شیطان کی خاصیت کُتّے کی سی ہے کہ جتنا اس سے دُور کر بھاگا جائے اُتنا ہی وہ اور زیادہ بھونکتا اور پیچھا کرتا ہے۔ اور اگر اس کی طرف التفات نہ کیا جائے یعنی نہ دُتکا جائے اور نہ بھگایا جائے

تو آپ ہی خاموش ہو کر واپس چلا جاتا ہے لہذا خطرات کا بہترین علاج یہی ہے کہ اُن کی طرف التفات ہی نہ کیا جائے اور غور و خوض تو ہرگز ہرگز نہ کیا جائے۔ خوض کرنے کے بجائے شفا ہونے کی پریشانی اور بڑھتی ہے اور خطرات کا بہت زیادہ ہجوم ہونے لگتا ہے۔ گو ان کا ہجوم دین کے لئے مطلقاً مُضر نہیں۔ کیونکہ بوجہ غیر اختیاری ہونے کے معصیت نہیں۔ لیکن اُن سے اذیت بہت ہوتی ہے، کبھی عوارضِ طبیعیہ کبھی رذائیلِ نفسانیہ، کبھی تصرّفات شیطانیہ کبھی معاصی اور کبھی حق تعالےٰ کی جانب سے طلب کا امتحان ہوتا ہے، وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں، وساوس کا بہترین علاج یہی ہے کہ نہ تو اُن کی طرف التفات کرے اور نہ خطرات میں اور نہ اُن کے اسباب میں غور و خوض کرے۔

۴۔ سالک یہ سمجھ کر پریشان ہوتا ہے کہ خطرات قلب کے اندر سے پیدا ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ شیطان باہر سے اُن خطرات کو قلب میں ڈالتا ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں ایسا متوہم ہوتا ہے کہ خطرات قلب کی تہہ میں گھسے ہوئے ہوتے۔ بلکہ حوالی قلب میں رہتے ہیں اور جو چیز داخل قلب میں متوہم ہوتی ہے۔ وہ خطرات نہیں ہوتے بلکہ اُن کا اثر اور انعکاس ہوتا ہے۔ کیونکہ داخل قلب میں واقع ہونے والی چیز تو صرف عقیدۂ راسخہ ہوا کرتا ہے نہ کہ خطرہ جو کہ محض ایک وہمی اور سطحی چیز ہے اور کچھ بھی نہیں۔

۵۔ سالک کو خطرات منکرہ سے پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ نہ ان کی بنا پر اپنے کو مردود سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان خطرات کو تو شیطان قلب میں ڈالتا ہے۔ تاکہ سالک کو خواہ مخواہ اُلجھائے رکھے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے نہایت شوق سے لپکتا چلا جا رہا ہے کہ راستہ میں اس کا دشمن ملا۔ اور اُس کو اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے واہی تباہی بکنے لگا۔ تاکہ میرے ساتھ اُلجھتا رہے۔ اور بادشاہ کے دربار میں حاضری سے محروم رہ جائے۔ اب عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس نالائق اور مردود کی بیہودہ بکواس کی طرف التفات ہی نہ کیا جائے ورنہ اگر ردّو کد شروع کر دی تو دربار کی حاضری کا وقت گذر جانے کا خدشہ ہے۔ بس اُس کو چاہیئے

کہ صبر کئے ہوئے خاموشی کے ساتھ چلتا چلا جائے۔ پھر جب دربار میں رسائی ہو جائے گی وہ کم بخت خود ہی پیچھا چھوڑ دیگا۔ سالک کو چاہیئے کہ کچھ غم اور فکر نہ کرے، کیونکہ خطرات غیر اختیاریہ پر مطلق مواخذہ نہیں۔ اور نہ وہ معصیت ہیں البتہ اذیت و کلفت ضرور ہوتی ہے۔ مگر اس پر اجر ملتا ہے۔ اور ترقی درجات ہوتی ہے۔

۶۔ قلب کی مثال شاہی سڑک کی سی ہے جس پر امیر، غریب، رذیل سب ہی چلتے ہیں کسی کو یہ حق نہیں کہ ایک دوسرے کو روکے اسی طرح قلب کی ساخت ہی منجانب اللہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے۔ کہ اس میں اچھے برے سبھی قسم کے خیالات کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو اس مطالبہ کا حق نہیں کہ میرے قلب میں اچھے خیالات ہی آیا کریں اگر بلا اختیار بُرے خیالات آتے ہیں تو کیا ڈر ہے ہاں قصداً بُرے خیالات نہ لائے۔ نہ اُن کو باقی رکھے، شدید قسم کے شیطانی وساوس سے ترقی درجات کے علاوہ بھی بہت سارے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً عجب و کبر کی جڑ کٹ جانا، تصرفات شیطانیہ کی انتہا معلوم ہو کر جھجک نکل جانا۔ جو کہ شرعاً عین مطلوب ہے۔

اگر مرتے وقت کسی کو ایسی حالت پیش آئے تو وہ گھبرا جائے اور خدا جانے گھبراہٹ میں کیا سمجھ بیٹھے۔ حالتِ حیات میں ایسی مصیبت پیش آجانے سے اس کا محقق ہو جاتا ہے اگر وقتِ مرگ یہ حالت پیش آئے تو موثر نہیں ہوتی۔ اور اطمینان اور محبتِ حق میں جان دے گا۔

(۷)۔ ان خطرات و وساوس کا سہل علاج یہ ہے کہ جب ایسے تخیلات کا ہجوم ہو، تو اپنے قصد و اختیار سے کسی نیک خیال کی طرف متوجہ ہو جانا اور متوجہ رہنا چاہیئے کیونکہ دو مختلف قسم کے خیالات ایک وقت میں جمع نہیں ہو سکتے اس کے بعد بھی اگر تخیلات باقی رہیں یا نئے آتے رہیں تو پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ اُن کا رہنا یا آنا غیر اختیاری ہے۔ اس عمل میں سرسری توجہ کافی ہے بہت شدت کے ساتھ کوشش نہ کرے اپنے آپکو زیادہ سے زیادہ ذکر اللہ میں مشغول رکھے۔ ایسی حالت میں ذکر اللہ میں دل نہیں لگا کرتا۔ جیسی بھی طبیعت ہو کوشش کر کے ذکر کرتا رہے بتدریج افاقہ محسوس ہوگا علاوہ ازیں کثرت سے استغفار و لاحول کا ورد کرتا رہے۔

طاعات سے باز رکھنے میں شیطان کے ہتھ کنڈے

بندہ جب مستقل مزاجی کے ساتھ طاعتِ الٰہی کے راستے پہ چل نکلتا ہے۔ تو شیطان کو سخت پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جلد ہی اگر اس کو کسی نہ کسی حیلے سے باز نہ رکھا گیا تو پھر اس کا میرے قابو میں آنا محال ہو جائے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ یکے بعد دیگرے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ کہ اگر ایک داؤ نہ چلا۔ تو دوسرا کارگر ہو جائے گا۔ اگر وہ بھی خطا ہو گیا تو تیسرا کام دیگا شیطان کے ان ہتھکنڈوں کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ پہلی تدبیر کے طور پر شیطان بندہ کو سستی وغیرہ میں مبتلا کر کے عبادتِ الٰہی سے روکتا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کی توفیق شاملِ حال ہوئی تو بندہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ مجھے دارالعمل سے دارالجزاء کی طرف کوچ کرنا ہے۔ لہٰذا مجھے عبادتِ الٰہی اور نیکیوں کی سخت ضرورت ہے۔

۲۔ شیطان کا دوسرا حربہ تاخیر کی تلقین کرنا ہے کہ چلو اگر عبادتِ الٰہی سے باز نہیں رہتا تو نہ سہی۔ کچھ تاخیر ہی کراؤ۔ اگر اللہ تعالےٰ اس سے بھی محفوظ کر لیتا ہے تو بندہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ زندگی مختصر ہے اور موت کا کوئی علم نہیں کہ کب آ جائے۔ اگر آج کا کام کل پر چھوڑ دوں۔ تو پھر کل کا کام کب کروں گا؟

۳۔ شیطان کا تیسرا حربہ جلدی اور عجلت کا تقاضہ ہے عام طور پر نماز کے اندر اس عجلت اور اضطراب کا مشاہدہ کثرت سے دیکھنے میں آتا ہے دنیا کا کوئی خاص کام درپیش نہ بھی ہو، تب بھی اکثر نمازیوں کو ایک عجلت اور بے چینی لگی رہتی ہے کہ جیسے کسی مصیبت میں پھنس گئے ہوں اور کب اس سے فراغت ملے اور کب گھر کو بھاگیں۔

۴۔ شیطان کا اگلا حربہ ریاء اور دکھلاوے کی تلقین کرنا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کا فضل شاملِ حال ہوا تو بندہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ مجھے اپنے جیسے کمزور انسانوں سے کیا لینا ہے۔ میں تو صرف رضائے الٰہی کا طالب ہوں۔

۵۔ اگر مندرجہ بالا ہتھکنڈوں سے بچ نکلے تو انسان کو عجب اور خود پسندی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ تو نے کتنا بڑا اور عمدہ کام کیا۔ تو تو اب بڑا عبادت گزار بن گیا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوا تو بندہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ میرا اس میں کوئی کمال نہیں ہے یہ محض اسی کا فضل و کرم ہے، جو

مجھے اپنی اطاعت کی توفیق دے رہا ہے ورنہ میں تو صبح سے شام تک گناہ ہی کرتا رہتا ہوں۔

۶۔ پھر شیطان انسان کے پاس چھٹے طریقے پر آکر بہکاتا ہے۔ کہ چونکہ تو اپنے اعمال کو پوشیدہ طور پر کرتا ہے، لہذا اب اللہ تعالےٰ تیرے اعمال کو مخلوق پر ظاہر فرما دیگا اس طرح سے بندہ کے اندر ریا و نمائش کا ارادہ پیدا کرتا ہے۔ تاکہ اُس کے اعمال کو ضائع کرادے۔ اگر اللہ تعالےٰ کا فضل شاملِ حال ہُوا۔ تو بندہ یہ کہہ کر شیطان کو رَدّ کر دیتا ہے کہ میں اللہ تعالےٰ کا بندہ ہوں اور وہ میرا مالک و آقا ہے۔ اگر چاہے تو وہ کسی چیز کو ظاہر فرمائے اور اگر چاہے تو پوشیدہ رکھے۔ وہ چاہے تو مجھے عزت بخشے اور چاہے تو ذلیل کردے۔

باقی ——— آئندہ

۷۔ اس کے بعد شیطان ساتواں داؤ استعمال کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان اعمال کے کرنے کی تجھے کیا حاجت اور ضرورت؟ اس لئے کہ اگر تو سعید پیدا کیا گیا ہے۔ تو اعمال کا چھوڑنا مضر نہیں۔ اور اگر بدبخت بنایا گیا ہے تو پھر اعمال کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اس پر بھی اگر اللہ تعالےٰ کی مدد شاملِ حال رہی تو بندہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ کہ مجھے طاعات کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے میں حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ اور اگر میں بدبخت ہوں تب بھی اعمال ضروری ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اور اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اگر میں نیک بخت ہوں تب بھی مجھے ان اعمال اور طاعات کی ضرورت ہے تاکہ قربِ خداوندی حاصل کرسکوں اور نیز ان فرائض و واجبات سے کسی کو فارغ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ پیغمبرؑ کو بھی نہیں تو میں کون ہوں۔ جو ان کو ترک کردوں۔

○۔ امور اختیاریہ میں عبادت یعنی پابندی احکام شریعت

اور

غیر اختیاریہ میں عبودیت یعنی تفویض یہی خلاصہ ہے

حیات کے دستور العمل کا۔

(ا۔ ع۔ ت)

المرشد

یوسف نوشہروی

اے لطفِ حق بیا بہرِ سبق — خوبئِ تو درس دادن بہرِ حق
سائلم افتادہ ام پیش وپست — شفقت تو کاش گردد ملتفت
راحتِ دردِ غمِ نالہ کناں — رہنما و رہبرِ گم گشتگاں
تو کجا غائب شدی اے مرشدی — جز تو یا ہم بے کسی آزردگی
ذکرِ ھو، آرائش وزیب لیث — بر دلث اسرارِ مخفی شققت
در گلوام عشق را آویختی — از سرم بروں حواسم ریختی
تا بہ کے قشکول را گیرم بدست — ابتدائے جنبش بالا و پست
نانِ شاہاں حاملِ شانِ شہی — نانِ تو دارد مقام عاجزی
از تنورے نانِ تازہ دہ مرا — از طعامِ پادشاہاں بہ مرا
بوئے جیفہ آید از مردار خور — بوے کرگس آید از بسیار خور
بوئے مشک آید زِ فیضِ مرشداں — الحفیظ والاماں از راھباں

وسعتِ خوانِ کرم رابیش کن
یوسف افسردہ را درویش کن

ریاکاری

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکیؒ

کیا ہے دُنیا جان اے مردِ غبّی — واسطے زر کے بنے تو متّقی،
شانہ و مسواک، تسبیح و ریا — جُبّہ و دستار و قلبِ بے صفا
ہے توقّع تجھ کو اے مردِ غبّی — تاکہ اِس جھوٹی فقیری سے تری
معتقد ہو کر کے سب اہلِ جہاں — لاتیں نظریں پاس تیرے بے گماں
اپنی خود بینی سے تو ہے مارتا — لاف تقوٰی اور عدالت کی سدا
کار تیرا سر بسر لیل و نہار — کرتا ہے تحصیلِ جاہ و اعتبار
جاہ و عزت کے لیئے اے بے خبر — دین و ایماں سے پڑا تو دُور تر
یہ نہیں معلوم تجھ کو اے عزیز — ہیں جہاں میں سینکڑوں اہلِ تمیز
یہ جو کرتا ہے فریب و مکر تو — اس سے واقف ہیں بے شک مو بمو
پر یقین ہے تجھ کو اب بے شک یہی — حال سے میرے نہیں واقف کوئی

ہے گماں تجھ کو کہ ایسے مکر سے
سارے عالم کو مطیع اپنا کرے

حکومتِ پاکستان

آفس آف دی چیف کنٹرولر برائے درآمدات و برآمدات

اسلام آباد ۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۸۳ء

کنٹرول درآمدی تجارت

پبلک نوٹس

درآمدی پالیسی آرڈر ۱۹۸۳ء —— شرائط برائے حصول لائسنس

نمبر 45 (83) امپورٹ I- چیف کنٹرولر برائے برآمدات کے پبلک نوٹس نمبر 14 (83) امپورٹ I مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۳ء متعلقہ شرائط برائے حصول لائسنس جو کہ درآمدی پالیسی کے حکم 1983ء کے تحت جاری ہوا- اس کے سلسلہ میں چیف کنٹرولر برائے درآمدات وبرآمدات نے موجودہ مالی سال کی پہلی سہ ماہی مختتمہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۸۳ء میں خوردنی تیل کے لائسنوں کے حصول کے ضمن میں بناسپتی گھی / پکانے کے تیل کی ملوں کے لئے مندرجہ ذیل شرائط مقرر کی ہیں۔

ا- بناسپتی گھی ملز:

ہر یونٹ کو سال میں اپنی منظور شدہ گنجائش کا ۴۰ فیصد درآمد کرنے کا حق ہوگا- بشرطیکہ انھوں نے اس سے پیشتر گھی کارپوریشن سے اپنی سالانہ منظور شدہ گنجائش کا بقیہ ۶۰ فیصد اُٹھالیا ہو یا انھوں نے اس مقدار کی مالیت کے برابر بنک گارنٹی مہیا کردی ہو

پہلی سہ ماہی کے اختتام پر یعنی ۳۰ ستمبر 1983ء تک جس مالیت کے لئے لائسنس جاری کیا جائے گا وہ یونٹ کے سالانہ استحقاق کے 25 فیصد یا $\frac{1}{4}$ سے زیادہ نہیں ہوگا۔

۲۔ پکانے کے تیل (کُکنگ آئل) ملز

ان یونٹوں کو سال میں اپنی سالانہ منظور شدہ گنجائش کی حد تک درآمد کا حق ہوگا۔

پہلی سہ ماہی کے اختتام پر یعنی ۳۰ ستمبر 1983ء تک جس مالیت کے لئے لائسنس جاری کیا جائے گا وہ سالانہ استحقاق کے 25 فیصد یا $\frac{1}{4}$ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

موجودہ مالی سال کی آخری تین سہ ماہیوں کے لئے لائسنس کے اجراء کی شرائط کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

دستخط

شوکت حسین

ڈائریکٹر سروے اینڈ آڈٹ

برائے

چیف کنٹرولر ایکسپورٹ امپورٹ

نمبر 1 (2) / P7.83

اسلام آباد 12/232

P.1.D

ہر قسم کے اعلےٰ کپڑے

کی

تھوک خریداری

کے

لیئے

طارق کلاتھ ہاؤس

مندر گلی نمبر ۱ فیصل آباد

فہرست مطبوعات ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دلائل السلوک (اردو) ـــــ ۲۵/۰۰
صوفی ازم (انگلش) ـــــ ۴۰/۰۰
حیاتِ برزخیہ ـــــ ۲۵/۰۰
تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین ـــــ ۲۵/۰۰
الدین الخالص ـــــ ۲۵/۰۰
حیاتِ انبیاء ـــــ ۱۰/۰۰
اطمینانِ قلب ـــــ ۱۰/۰۰
تعمیرِ سیرت ـــــ ۷/۵۰
لغزشیں ـــــ ۷/۵۰
حضرت امیر معاویہؓ ـــــ ۷/۵۰
اسرار الحرمین ـــــ ۵/۰۰
انوار التنزیل ـــــ ۵/۰۰
کس لئے آئے تھے؟ ـــــ ۵/۰۰
تعارف ـــــ ۳/۰۰

خدایا ایں کرم بارِ دگر کن ۷/۵۰
دیارِ حبیب میں چند روز ۵/۰۰
دین و دانش ـــــ ۵/۰۰
مغالطے ـــــ ۵/۰۰
پاکیزہ معاشرہ ـــــ ۷/۵۰
فضائل توبہ استغفار ـــــ ۲۰/۰۰
المرشد (فی شمارہ) ـــــ ۳/۰۰
حج کی دعائیں ۳ حصے ۵/۰۰
ذکر اللہ (عربی) ـــــ ۳/۰۰
بزم انجم ـــــ ۱۵/۰۰
فوزِ عظیم ـــــ ۱/۵۰
علم و عرفان مع تلاش ۳/۰۰
سالانہ چندہ المرشد ـــــ ۳۵/۰۰
کونوا عباد اللہ (زیر طبع)
ایمان بالقرآن کلاں ـــــ ۲۰/۰۰

۹۹
ماہنامہ المرشد
زیر سرپرستی
حضرت العلام مولانا اللہ یار خان صاحب مدظلہ
اصلاحِ احوال باطنی اصلاح
سالانہ چندہ
پینتیس ۳۵ روپے

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان منارہ ضلع جہلم ۰ سول ایجنٹ مدنی کتب خانہ گنپت روڈ لاہور
کتبہ: مشتاق حسین رضوی